شمار	مضمون	صفحہ
۱۴	مولانا ابوالکلام آزاد اور قومی جدوجہد	۳۰۲
۱۵	نجیب محفوظ	۴۵۵
۱۶	نسخۂ حمیدیہ سے نسخۂ شیرانی تک	۲۰۴
۱۷	نظریاتی سطح پر عصر جدید کا چیلنج اور مذہب	۵ ، ۸۵
۱۸	ہندوستان میں علوم قرآنی کا نشو و نما اور اسلامی معاشرہ پر اس کا اثر	۴۰۵
	استفسار و جواب	
۱	سورۂ انعام کی چند آیتوں میں خطاب اور ضمیروں کی تعیین	۳۷۴
	معارف کی ڈاک	
۱	مکتوب پیرس	۳۹۰
۲	مکتوب ڈربن	۱۴۳
۳	مکتوب مدینہ منورہ	۳۹۲
۴	مکتوب مسقط	۱۴۷
	تلخیص و تبصرہ	
۱	امریکہ میں مسلمان	۵۹
	اخبار علمیہ	۶۱، ۱۳۹، ۲۳۲
	وفیات	
۱	مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی	۳۹۳
	ادبیات	
۱	حمد	۶۵
	باب التقریظ والانتقاد	
۱	السیرۃ النبویہ (طبع ہفتم)	۶۶
۲	المرتضیٰ	۴۵۹
۳	رسالوں کے خاص نمبر	۱۵۱ ، ۲۳۴

جلد ۱۴۳ ماہ جمادی الثانیہ ۱۴۰۹ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۸۹ء عدد ۱

مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
شذرات	ضیاء الدین اصلاحی	۲ - ۴
مقالات		
نظریاتی سطح پر عصر جدید کا چیلنج اور مذہب	جناب سید ولی حسین جعفری ہمدرد نگر، نئی دہلی	۵ - ۲۱
تصوف و سلوک شاہ ہمدان کی تحریروں میں	پروفیسر سید وحید اشرف صدر شعبۂ فارسی مدراس یونیورسٹی	۲۲ - ۳۴
سینما ہے یا صنعت آذری ہے؟ (اقبال کی نظم "سینما" قرآن و حدیث کی روشنی میں)	جناب محمد بدیع الزماں صاحب ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پٹنہ	۳۵ - ۵۰
کیا محمد بن القاسم ظالم تھا یا انصاف پسند فاتح؟	ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں صاحب دہلی	۵۱ - ۵۸
تلخیص و تبصرہ		
امریکہ میں مسلمان	ش ۔ د	۵۹ - ۶۰
اخبار علمیہ	ع ۔ ص	۶۱ - ۶۴
ادبیات		
حمد	جناب فضا ابن فیضی ۔ مئو	۶۵
باب التقریظ والانتقاد		
السیرۃ النبویۃ (طبع ہفتم)	"ض"	۶۶ - ۷۷
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۷۸ - ۸۰

شمار	مضمون	صفحہ
۱۴	مولانا ابوالکلام آزاد اور قومی جدوجہد	۳۰۲
۱۵	نجیب محفوظ	۴۵۵
۱۶	نسخۂ حمیدیہ سے نسخۂ شیرانی تک	۲۰۴
۱۷	نظریاتی سطح پر عصر جدید کا چیلنج اور مذہب	۸۵، ۵
۱۸	ہندوستان میں علوم قرآنی کا نشوونما اور اسلامی معاشرہ پر اس کا اثر	۴۰۵
	استفسار وجواب	
۱	سورۂ انعام کی چند آیتوں میں خطاب اور ضمیروں کی تعیین	۳۷۴
	معارف کی ڈاک	
۱	مکتوب پیرس	۳۹۰
۲	مکتوب ڈربن	۱۴۳
۳	مکتوب مدینہ منورہ	۳۹۲
۴	مکتوب مسقط	۱۴۷
	تلخیص وتبصرہ	
۱	امریکہ میں مسلمان	۵۹
	اخبار علمیہ	۲۳۲، ۱۳۹، ۶۱
	وفیات	
۱	مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی	۳۹۳
	ادبیات	
۱	حمد	۶۵
	باب التقریظ والانتقاد	
۱	السیرۃ النبویہ (طبع ہفتم)	۶۶
۲	المرتضیٰ	۴۵۹
۳	رسالوں کے خاص نمبر	۲۳۴، ۱۵۱

جلد ۱۴۳ ماہ جمادی الثانیہ ۱۴۰۹ھ مطابق ماہ جنوری سنہ ۱۹۸۹ء عدد ۱

مضامین

شذرات — ضیاء الدین اصلاحی — ۴-۲

مقالات

نظریاتی سطح پر عصر جدید کا چیلنج اور مذہب — جناب سید ولی حسین جعفری، ہمدرد نگر، نئی دہلی — ۲۱-۵

تصوف وسلوک شاہ ہمدان کی تحریروں میں — پروفیسر سید وحید اشرف صدر شعبۂ فارسی، مدراس یونیورسٹی — ۳۴-۲۲

سینما ہے یا صنعت آذری ہے؟ (اقبال کی نظم "سینما" قرآن وحدیث کی روشنی میں) — جناب محمد بدیع الزماں صاحب، ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، پٹنہ — ۵۰-۳۵

کیا محمد بن القاسم ظالم تھا یا انصاف پسند فاتح؟ — ڈاکٹر ظفر الاسلام خان صاحب دہلی — ۵۸-۵۱

تلخیص وتبصرہ

امریکہ میں مسلمان — ش۔ د — ۶۰-۵۹

اخبار علمیہ — ع۔ ص — ۶۴-۶۱

ادبیات

حمد — جناب فضا ابن فیضی، مئو — ۶۵

باب التقریظ والانتقاد

السیرۃ النبویہ (طبع ہفتم) — "ض" — ۷۷-۶۶

مطبوعات جدیدہ — "ض" — ۸۰-۷۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

جناب سیٹھ عبدالعزیز انصاری صاحب کا غم ابھی تازہ ہی تھا کہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے ایک اور بہت معزز اور باوقار رکن جناب سید اطہر حسین صاحب آئی۔ اے۔ ایس بھی رحلت فرما گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

وہ یکم مارچ ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے، اعلیٰ تعلیم کے لیے الٰہ آباد یونیورسٹی میں داخل ہوئے، اور ایم ایس سی کی ڈگری لینے کے بعد ۱۹۴۲ء میں سرکاری ملازمت میں آگئے، ڈپٹی کلکٹری سے ترقی کرکے آئی۔ اے ایس ہوئے اور حکومت اترپردیش کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے، تقریباً سات برس تک مرکزی حکومت سے وابستہ رہے، ملازمت کے دوران مصر و امریکہ کے سفر بھی کیے، آخر میں ریاستی حکومت کے سکریٹری کی حیثیت سے ریٹائر ہوکر فیض آباد میں مستقل طور پر قیام پذیر ہوگئے تھے کہ یہیں ۲۰ر دسمبر کو قلبی عارضہ میں انتقال ہوگیا، والبقاء للہ وحدہ۔

جناب سید اطہر حسین صاحب نے سرکاری ملازمت کی گوناگوں مشغولیتوں کے باوجود تحریر و تصنیف کا مشغلہ بھی جاری رکھا، اور انگریزی اور اردو میں اسلام کے مختلف پہلوؤں پر چھوٹی بڑی درجنوں کتابیں یادگار چھوڑیں، شعر و سخن کا بھی عمدہ ذوق تھا، اس کی ابتدا رفیقۂ حیات کی غمناک موت سے ہوئی، وہ بڑے زود گو تھے، بہت جلد ان کی غزلوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے، پھر نعتیہ اور مذہبی شاعری کی طرف متوجہ ہوئے، وہ بڑے اچھے مترجم بھی تھے، متعدد اہم دینی کتابوں کے ترجمے انگریزی میں کیے، انتقال سے ایک ماہ قبل جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کی کتاب "اسلام میں مذہبی رواداری" کا انگریزی ترجمہ مکمل کرکے دارالمصنفین بھیجا، ان کو ترجمہ پر حیرت انگیز قدرت تھی، ۱۹۸۲ء میں وہ کسی سرکاری کام سے دہلی گئے تھے، اسی زمانہ میں ہمدرد نگر میں بین الاقوامی قرآن کانگریس ہورہی تھی، اپنی دلچسپی کی وجہ سے اس میں بھی شریک ہوئے، وہ کوئی مقالہ لکھ کر نہیں لے گئے تھے، مگر جب انھیں بلایا گیا تو انھوں نے میرے مقالہ "قرآن مجید کا تصور توحید" کے ضروری حصوں کا انگریزی ترجمہ فی البدیہہ کرکے سنا دیا جو اسی جلسہ میں چند منٹ پہلے پڑھا گیا تھا۔

جناب سید اطہر حسین صاحب نے اپنی دیانت داری، ایمان داری، اصول پسندی اور خوش انتظامی کی وجہ سے بڑی نیک نامی اور اچھی شہرت حاصل کی، سرکاری حلقوں میں وہ مسلمانوں کے معاملات کے بڑے واقف کار سمجھے جاتے تھے، اور مسلمانوں کے بارے میں حکومت ان سے صلاح و مشورہ کرتی تھی، مسلمانوں کو بھی ان پر اعتماد تھا، جناب سید صدیق حسن صاحب مرحوم کے بعد وہ مسلمان عہدہ داروں میں اس حیثیت سے ممتاز تھے، اوقاف کی اصلاح و تنظیم میں انھوں نے نمایاں جد و جہد کی، فیض آباد میں ان کی کوششوں سے امیر وجاہت لائبریری قائم ہوئی اور لکھنؤ میں مسلم مسافر خانہ کی تعمیر بھی ان کا کارنامہ ہے، وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے، سرکاری ملازمت کے زمانہ میں اپنے چیمبر میں ظہر کی نماز ادا کرتے، اس پر بعض لوگوں کو اعتراض ہوا مگر انھوں نے کوئی پروا نہیں کی، سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں مصر گئے تو موقع نکال کر عمرہ بھی کیا اور روضۂ اطہر کی زیارت بھی کی، اپنی آپ بیتی "ایک سمیلین کی سرگزشت" میں اس کا ذکر بہت والہانہ انداز میں کیا ہے، ان کو دارالمصنفین سے بڑا تعلق تھا، اور وہ اس کے بڑے متحرک اور سرگرم ممبر تھے، ان کی وفات دارالمصنفین کے لیے ایک بڑا سانحہ ہے، اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت کرے، اور ان کے اعزہ و متوسلین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

مستشرقین نے اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو مسخ کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا ہے، ان کے اثرات اتنے وسیع، دور رس اور گہرے ہیں کہ خود مسلمان بھی اپنی تاریخ اور ماضی کے اپنے پُر عظمت کارناموں کے بارے میں بڑی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں، ہندوستان میں مسلمانوں کے دور حکومت کو مغرب کے دانشوروں نے جس رنگ میں پیش کیا ہے اس کو آزادی کے بعد بھی ان کے طوطی صفت ہندوستانی مورخین برابر دُہرا رہے ہیں، حکومت اتحاد اور قومی یکجہتی کی باتیں کرتی ہے، لیکن اسکولوں اور کالجوں میں تاریخ کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان سے نفرت، تفریق اور غلامی کے رجحانات اور زہریلے

اثرات بڑھتے ہی جارہے ہیں۔

مستشرقین کے زہر کا تریاق مہیا کرنے کا خیال سب سے پہلے مولانا شبلی مرحوم کو ہوا، وہ پوری تیاری اور سروسامان کے ساتھ اس میدان میں اترے تھے، کئی برس پہلے اس موضوع پر دارالمصنفین نے ایک سیمینار منعقد کیا تھا، جس کی چھ جلدیں یہاں سے چھپ چکی ہیں، اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے کی مستشرقین کی مہم کے تار و پود بکھیرنے کے لیے اب نئی دہلی میں انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز کا قیام عمل میں آیا ہے، اس کی جانب سے ۲۶، ۲۷ دسمبر ۱۹۸۸ء کو مدراس کے نیو کالج میں "اسلام کی روشنی میں تاریخ کا مطالعہ" کے موضوع پر ایک سیمینار ہوا، اس میں مدراس اور اس کے قرب و جوار نیز دہلی، علی گڑھ، رام پور، حیدرآباد، آسام اور گوا کے مندوبین شریک ہوئے، امریکہ سے ڈاکٹر احمد اللہ صدیقی اور ڈاکٹر خالد احمد یحییٰ اور آسٹریلیا سے ڈاکٹر اطہر عباس رضوی نے بھی شرکت کی، اکثر مقالے پُر مغز تھے اور ان پر مفید بحث بھی ہوئی، راقم نے اس میں "اصول تاریخ اور مورخین کی غلطیوں کے اسباب" (ابن خلدون کے نقطۂ نظر سے) کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کیا تھا۔

مدراس اور دارالمصنفین کا تعلق بہت قدیم ہے، حضرت سید صاحبؒ کی مقبول ترین کتاب "خطبات مدراس" کے آٹھوں خطبے اسی سرزمین پر دیئے گئے تھے، نیو کالج بڑے وسیع رقبہ میں ہے، اس کی اپنی خوبصورت عمارتیں، شاندار مسجد، ہوسٹل اور دکانیں ہیں، باغ دیوان صاحب کا مدرسہ محمدی اور رضا نوادۂ شرف الملک کا نوادر اور اہم مخطوطات پر مشتمل کتب خانہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی، جلد ہی مدرسہ محمدی کا صد سالہ جشن ہونے والا ہے جس کی تیاری شروع ہو گئی تھی، دارالمصنفین کے سابق رفیق اور اب اس کی مجلس انتظامیہ کے مخلص رکن مولانا محمد یوسف کوکن صاحب سے ان کے وطن میں ملنے کا بڑا اشتیاق تھا، وہ ایک حادثہ کی وجہ سے نقل و حرکت سے معذور تھے، اللہ تعالیٰ انھیں صحت دے، وہ اور ان کی اہلیہ نے بڑی پذیرائی کی، ایک وقت کھانے پر بلایا، نیو کالج کے عربی کے پروفیسر جناب جی عبدالرشید صاحب برابر ساتھ رہے، ان کو دارالمصنفین سے بڑا تعلق تھا، معارف کی توسیع اشاعت کی مہم چلانے کے عزم کا اظہار کیا۔

اس وقت ملک میں سیمناروں کا زور ہے، دارالمصنفین کے بعض مخلصین بھی سیمینار کیلئے اصرار کر رہے ہیں، اس پر غور ہو رہا ہے

مقالات

نظریاتی سطح پر عصر جدید کا چیلنج اور مذہب

از

جناب حافظ سید ولی حسین جعفری، ہمدرد نگر، نئی دہلی

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو معارف ماہ جولائی ۱۹۸۸ء)

(۴)

نبوت | نبوت کے متعلق تمام لوگوں میں ایک عالمگیر غلطی پھیلی ہوئی تھی، ہر فرقہ اور ہر گروہ یہ سمجھتا تھا کہ انبیاءؑ انسان کے درجہ سے بالاتر ہوتے ہیں، یہی خیال تھا جس نے رام، کرشن، زردشت اور حضرت عیسیٰؑ کو عین خدا یا کم از کم خدا کی طرح بنا دیا تھا۔

اسلام نے نہایت زور و شور اور مکمل وضاحت کے ساتھ یہ بتا دیا کہ انبیاءؑ بشریت کے دائرہ سے باہر نہیں ہیں:

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ (کہف: ۱۱۰)

کہہ دو، میں تو تم ہی جیسا بشر ہوں، میرے پاس بس یہ وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔

حضرت مسیحؑ کے بارے میں فرمایا:

لَن يَسْتَنكِفَ الْمَسِيحُ أَن يَكُونَ عَبْدًا لِّلَّهِ (النساء: ۱۷۲)

مسیح ہرگز خدا کے بندے ہونے سے انکار نہ کریں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی کہا گیا :

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِىْ	کہہ دو کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا ہوں کہ
خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ	میرے پاس خدا کے خزانے ہیں
الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ	اور نہ میں غیب کو جانتا ہوں، اور نہ
اِنِّىْ مَلَكٌ، اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا	تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں
يُوْحٰٓى اِلَىَّ -	میں تو صرف اس چیز کی اتباع کرتا ہوں
(انعام : ۵۰)	جو میرے پاس وحی آتی ہے ۔

دوسری جگہ ہے ؛

وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ	اور اگر میں غیب جانتا تو میں بہت سی
مِنَ الْخَيْرِ - (اعراف : ۱۰۸)	بھلائی لے لیتا ۔

دنیا میں جتنے مذاہب گذرے ہیں سب نے الوہیت اور نبوت کے ڈانڈے ملا دیے تھے، یا کم سے کم ان کو قریب کر دیا تھا، صرف اسلام نے ان دونوں کو بالکل الگ الگ رکھا، مسلمان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاءؑ سے بزرگ اور افضل ماننے کے باوجود حضرت ابراہیمؑ کو خلیل اللہ، حضرت موسیٰؑ کو کلیم اللہ اور حضرت عیسیٰؑ کو روح اللہ کہتے ہیں، مگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو محض رسول اللہ کے لقب سے یاد کرتے ہیں، صرف اسی قدر نہیں، بلکہ نمازوں میں جب شہادتین ادا کرتے ہیں، تو رسالت کے اقرار سے پہلے عبدہٗ کا لفظ کہتے ہیں، اس لیے کہ خدا کی توحید کا کمال یہی ہے کہ اس کے آگے کوئی شخص چاہے وہ کسی درجہ کا ہو بندگی کے درجے سے بڑھنے نہ پائے، مولانا شبلی نعمانی مرحوم کا قول ہے کہ "چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خالص توحید دلوں میں بٹھانی تھی، اس لیے ضروری تھا کہ خود

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے صرف عبدیت اور رسالت کا سادہ لقب اختیار کیا جائے[1] ۔

نبوت پر اعتراضات اس طرح کے کیے جاتے تھے کہ اس کا مقصد اعتقادات اور اصلاح معاش و معاد کی تعلیم ہے، لیکن ان امور کے لیے خود عقل کی رہنمائی کافی ہے، اس کے علاوہ مذہب کا اصل مقصد خدا کا اعتقاد، اعمال حسنہ کی پابندی اور اعمال قبیحہ سے احتراز ہے، جس شخص میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں، ضروری ہے کہ وہ نجات کا مستحق ہو، لیکن انبیاءؑ ان باتوں کے ساتھ اپنی نبوت کے اقرار کو بھی جزو ایمان قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو آدمی ان کو پیغمبر تسلیم نہیں کرے گا، وہ توحید اور اعمال حسنہ کے باوجود ناجی نہ ہوگا۔
اس کے علاوہ اشاعرہ وغیرہ کا یہ رجحان کہ نبوت کے لیے معجزہ شرط ہے، نیز خرق عادت کی قید نے نبوت کو اور بھی زیادہ قابل بحث بنا دیا، اسلام اس لیے آیا تھا کہ مذہبی اصول کے بارے میں آج تک جو خوش اعتقادیاں چلی آرہی تھیں اور جنھیں قصداً اپنے حال پر باقی رہنے دیا گیا تھا، ان کو قطعاً رفع کر دیا جائے، وہ اس لیے آیا تھا کہ قیامت تک ہر قسم کی ترقی اور اصلاح سے مذہب کو مستغنی کر دے چنانچہ اس نے جس طرح توحید کو مکمل کیا تھا اسی طرح نبوت کی اصل حقیقت بھی کھول کر رکھ دی، اس لیے اس نے سب سے پہلے اس فلسفہ پر زور دیا کہ جو چیزیں بشریت سے بالاتر ہیں، وہ پیغمبر میں نہیں ہوتیں، اس کے بعد اس عالمگیر غلطی کو دور کیا کہ نبوت اور معجزہ میں تلازم ہے، منکرین جو معجزات طلب کرتے تھے اور نبوت کو معجزہ پر موقوف سمجھتے تھے، ان کے جواب مختلف طریقے سے دیے لیکن ہر جگہ اس حقیقت کو ظاہر کر دیا کہ نبوت معجزہ پر موقوف نہیں ہے۔

---

[1] علامہ شبلیؒ : الکلام حصہ دوم، نامی پریس، ۱۹۰۳ء، ص ۱۱۲۔

سورۂ بنی اسرائیل آیات ۹۰ تا ۹۳ میں منکرین کے جو مطالبات مذکور ہیں ان سب کے جواب میں اللہ نے صرف یہ کہا:

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ	کہہ دو کہ میرا خداوند پاک ہے، میں
كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔	نہیں ہوں مگر ایک آدمی پیغام
(بنی اسرائیل: ۹۳)	پہونچانے والا۔

اس میں اصل نکتہ اس بات کی طرف ہے کہ یہ لوگ جن باتوں کو طلب کرتے ہیں، وہ ناممکن اور محال نہیں ہیں، اس کے باوجود اللہ نے ان کے اظہار سے اعراض کیا جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ یہ باتیں خدا کے اختیار میں نہیں، لیکن نبوت کے ثبوت میں ان کو پیش کرنا اسی قدیم غلطی میں لوگوں کو مبتلا رکھنا ہے، ورنہ خرق عادات کے پیش کرنے سے انکار اس بنا پر نہ تھا کہ خدا ان پر قادر نہیں، ایک آیت میں خدا خود فرماتا ہے:

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ	اور ان لوگوں نے کہا ان پر ان کے
اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ، قُلِ اللّٰهُ	خداوند کی طرف سے کوئی نشانی کیوں
قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ يُّنَزِّلَ	نہیں اتاری جاتی، کہہ دو کہ اللہ بلاشبہ
اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ	اس پر قادر ہے کہ کوئی نشانی اتار دے
لَا يَعْلَمُوْنَ (انعام: ۳۷)	مگر ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔

امام رازی سورۂ عنکبوت کی آیت وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ الخ کی تفسیر میں لکھتے ہیں: پیغمبر کے لیے معجزہ شرط نہیں، اسی وجہ سے ایسے انبیاءؑ بھی گذرے ہیں جن کو معجزات نہیں دیے گئے، جیسے ادریس، شیثؑ و شعیب علیہم السلام، شاہ ولی اللہؒ

[۱] الکلام حصہ دوم ص ۸۸ - از مولانا شبلیؒ

معجزات اور اجابت دعا، اور اس قسم کی باتوں کو اصل نبوت سے بالکل خارج سمجھتے ہیں لیکن اکثر حالات میں نبوت کے ساتھ لازم سمجھتے ہیں[۱]، امام راغب اصفہانی کہتے ہیں کہ انبیاءؑ کو دو قسم کے معجزات دیے جاتے ہیں، پہلی قسم یہ ہے کہ پاک نسب ہوتے ہیں، ان کے چہرہ پر وہ نور ہوتا ہے جو دلوں کو فریفتہ کر لیتا ہے، ان کے اخلاق ایسے ہوتے ہیں جو قلوب کو مسخر کر لیتے ہیں، اور ان کی تقریر ایسی ہوتی ہے جس سے سامع کو تشفی ہوتی ہے، اس کے بعد فرماتے ہیں کہ جب یہ صورت ہو تو سمجھ دار آدمی کو کسی معجزہ کی ضرورت نہیں رہتی اور وہ کسی معجزہ کا طالب نہیں ہوتا[۲]۔

امام غزالیؒ المنقذ من الضلال میں نبوت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہدایات اور بشارات پر بار بار غور کرے گا اس کو خود آپ کی نبوت پر یقین ہو جائے گا، بعد میں فرماتے ہیں کہ نبوت پر یقین اسی طرح سے لانا چاہیے نہ کہ لاٹھی کے سانپ بن جانے یا چاند کے شق ہو جانے سے[۳]۔

عقل و مذہب کا تعلق | مذہب کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں اس وجہ سے بھی پیدا ہوئی ہیں اور لوگ مذہب سے متنفر ہوئے ہیں کہ وہ انبیاءؑ کے اصول اور طور طریقوں کو ملحوظ نہیں رکھتے اس موضوع پر امام رازیؒ، ابن رشدؒ اور شاہ ولی اللہؒ نے سیر حاصل بحث کی ہے جس سے عقل اور مذہب کا باہمی تعلق واضح ہوتا ہے، حالانکہ اس اہم موضوع کو علامہ شبلی نعمانیؒ کے بقول علم کلام کی کتابوں میں بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، نیز منصب نبوت کی اہمیت کو سمجھنے اور سمجھانے میں مذکورۂ بالا حضرات نے بہت اہم کردار ادا کیا جس کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کرے گی۔

خلیفہ بنو عباس کے زمانہ میں جب مذہب نے فلسفہ سے میل جول بڑھایا تو اس کے

[۱] الکلام حصہ دوم ص ۸۷ [۲] ایضاً ص ۱۰۴ [۳] ایضاً ص ۸۹۔

باوجود مذہب اسلام نے اپنا تشخص برقرار رکھا، مگر اس دور میں عقائد کے بارے میں زیادہ تر بحث ومباحثے ہوتے تھے، جس میں اہم چیز وجود باری تعالیٰ، نیز نبوت اور اس کے متعلقات تھے، یہ بات قابل غور ہے کہ اس زمانہ میں مخالفین اسلام نے جو اعتراضات کیے تھے، وہ زیادہ تر عقائد ہی کے بارے میں تھے۔

مگر جیسے جیسے زمانہ ترقی کرتا گیا، ایجادات اور اختراعات ہونے لگیں، مغرب کا تسلط مشرق پر استعمار کی صورت میں بڑھنے لگا تو مغربی اقوام نے اسلام کے بارے میں علمی انداز سے پھر سے تنقید کا دور شروع کیا، اور کوشش یہ ہونے لگی کہ خود مسلمان جہاں جہاں بھی ہیں اسلام سے بدظن ہوں، اس انداز فکر کا یہ نتیجہ نکلا کہ عقائد سے قطع نظر تاریخی، اخلاقی، تمدنی حیثیت سے مذہب اسلام کو جانچنے کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا[1]، اور ایک لحاظ سے اصول یہ مرتب ہوا کہ کسی مذہب کے عقائد اس قدر قابل اعتراض نہیں جس قدر اس کے قانونی اور اخلاقی مسائل، اس اصول کی زد اسلام پر پڑنا ناگزیر تھی، اس لیے کہ اس کے قانونی، اخلاقی، معاشرتی اور معاشی مسائل سب مذہب اسلام سے مرتب ہیں، اور قانون سازی میں بھی صرف اسی کے اصول مدنظر ہوتے ہیں، نہ کہ جمہور اور مجلس قانون ساز کے اختیارات۔

مذہب کی اس نئی فکر نے کسی مذہب میں تعدد نکاح، طلاق اور جہاد کے جواز کو اس مذہب کے باطل ہونے کی سب سے بڑی دلیل مانا، نیز معیشت میں بے راہ روی جس کا نتیجہ سود در سود پر نکلتا ہے، اس طرح کی بندش کو مذہب کے پس ماندہ ہونے کی سب سے اہم وجہ بتائی، اسی طرح کے اور بھی بہت سارے معاشرتی اور اخلاقی پہلوؤں کو مغربی فکر نے ہدف بنایا۔

شروع ہی سے ان مسائل کا مقابلہ کیا گیا جن میں ابومسلم اصفہانی، امام غزالی، ابن رشد اور شاہ ولی اللہ بہت مشہور ہیں۔

[1] الکلام حصہ دوم ص ۶ از مولانا شبلیؒ

ان حضرات نے نہایت دلکش انداز اختیار کیا، نیز دلائل کے بیان میں بہت ہی سادہ پیرایہ اختیار کیا، اس کے برعکس قدیم طریقہ میں مسائل کی منطقی اصطلاحات اور نہایت دقیق خیالات سے کام لیا جاتا تھا، اس طریقہ سے مخالف مرعوب ہو کر خاموش ہو جاتا تھا، لیکن اس کو یقین نہیں ہوتا تھا۔

سائنس ومذہب میں تصادم

صورت حال اس لیے بگڑی کہ جب سائنس اور مذہب دونوں نے اپنے اپنے دائرۂ عمل سے نکل کر ایک دوسرے کے میدان میں قدم رکھا اور علم وعقل کا استعمال بند ہو گیا، قرآن نے اس بات پر ہمیشہ زور دیا کہ کائنات کی ہر چیز اللہ نے انسان کے لیے بنائی ہے اور اسی کی مزید وضاحت رسول اللہ کے اس قول میں ملتی ہے کہ دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے اور تم لوگ آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو، جب انسان نے اپنے آپ کو کلیسا کے جبر وظلم سے آزاد کرانا چاہا تو اپنے مذہب ہی کو اتار پھینکا، اس لیے کہ یہاں مذہب کی نمائندگی علم اور عقل کے نام پر نہ تھی، بلکہ تقلید، اوہام پرستی اور شخصیت پرستی کے نام پر تھی، اور یہ لوگ جمود وتعطل کے اصل ذمہ دار تھے۔

علامہ شبلیؒ نعمانی مرحوم نے اس طرح کے واقعات قلمبند کیے ہیں، مثلاً گلیلو نے جو دوربین کا موجد گذرا ہے، ایک کتاب کوپرنکس کی حمایت میں لکھی جس میں ثابت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، اس پر مجلس احتساب نے فتویٰ دیا کہ وہ مستوجب سزا ہے[1]۔

کولمبس نے جب کسی نئے جزیرہ کے دریافت ہونے کی امید پر سفر کرنا چاہا تو کلیسا نے فتویٰ دیا کہ اس قسم کا ارادہ مذہب کے خلاف ہے[2]۔ مذہب سے مراد فوق الفطرۃ چیزوں کا اعتقاد ہے، جو کسی نہ کسی صورت میں عام مذاہب میں پایا جاتا ہے[3]، عقلیات سے مقصود اس کی

[1] الکلام حصہ دوم ص ۱۲ [2] ایضاً ص ۱۲ [3] عبدالباری ندوی، مذہب وعقلیات ۱۹۱۹ء ص ۱۔

دو مختلف شاخیں سائنس اور فلسفہ ہے[۱]، مذہب اور سائنس کے حدود بالکل جُدا جُدا ہیں، سائنس کا جو موضوع ہے، مذہب کو اس سے کچھ واسطہ نہیں، اور مذہب کو جن چیزوں سے بحث ہے، سائنس کو اس سے کوئی سروکار نہیں، فلسفہ البتہ کہیں کہیں مذہب سے ٹکراتا ہے، لیکن اس کا شمار قطعیات اور یقینیات میں نہیں۔

فلسفہ و مذہب فلسفہ اور مذہب میں بے شک تصادم ہوسکتا ہے، لیکن دونوں کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے، فلسفہ کا منشا فوق الفہم چیزوں سے متعلق عقلی موشگافیوں کی تسکین بخشی ہے، مذہب جہاں عقل کی رسائی نہیں، ایمان و اعتقاد پر بس کرتا ہے، اس قسم کا ایمان و اعتقاد کسی نہ کسی صورت میں داخل فطرت ہے، پروفیسر عبدالباری ندوی لکھتے ہیں:

"مذہب و سائنس کی بے تعلقی کو پوری طرح سمجھنے کے لیے پہلے ان کے باہمی فرق اور بعد حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے، ریل کی دو گاڑیاں ٹکراتی ہیں، اور ٹکرا سکتی ہیں، لیکن ریل گاڑی اور جہاز میں تصادم ناممکن ہے، بعینہ یہی حال سائنس اور مذہب کا ہے، سائنس کا مذہب کے حق میں داخل ہونا اس سے زیادہ محال ہے، مذہب جہاں سے شروع ہوتا ہے، سائنس کی رسائی وہاں ختم ہوجاتی ہے، سائنس کی بحث و تحقیق کا تعلق تمام تر فطرت کے واقعات، مشاہدات اور تجربات سے ہے، مذہب کی بنا یکسر فوق الفطرت اور تجربہ و مشاہدہ کی دسترس سے ماورا چیزوں پر ہے، مثلاً خدا، روح، حشر و نشر[۲]"

اسلام کی بنیاد علم و عقل پر ہے اوپر ذکر آچکا ہے کہ علم اور عقل اسلام میں اساس کا درجہ رکھتی ہے اور ہر دور میں یہی دو ہتھیار ایسے تھے جن سے مسلمانوں نے کام لیا، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم زمانہ میں علم کے عام نہ ہونے کا سبب یہ تھا کہ تحریر و کتابت کو ہر ملک میں ایک گروہ نے اپنے لیے

۱؎ مولانا عبدالباری ندوی: مذہب و عقلیات ۱۹۱۹ء ص ۲ ۲؎ ایضاً ص ۵ و ۶۔

مخصوص کر لیا تھا، اور دوسروں پر اس کا دروازہ بند تھا، کیونکہ علم خاص خاص طبقوں کی میراث تھا، اور دوسروں میں اس کی اشاعت ممنوع تھی، دنیا کی قدیم تہذیبیں دین و مذہب کی بنیادوں پر استوار ہوئی تھیں، مگر اسلام کے علاوہ کسی دین نے بھی اپنی دعوت کی اساس علم و عقل پر نہیں رکھی تھی[۱]، تمام مذہبوں نے اپنی دعوت میں عقل و استدلال سے نہیں، صرف معجزات و خوارق سے کام لیا، عقل انسانی کو مخاطب نہیں کیا، عقل سے کام لینے کا حکم بھی نہیں دیا، اسی لیے قدیم دنیا میں علم کی اہمیت بھی تسلیم نہ کی گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ اہل ادیان و مذاہب جمود و تعطل و توہمات کے دلدل میں دھنستے چلے گئے[۲]

اسلام نے علم کی ضرورت اور اس کی برتری کا اعلان کیا، اس لیے کہ علم نہ ہو تو دین کا کوئی معاملہ کما حقہ استوار ہوسکتا ہے، نہ دنیا کا، اسلام نے اس امر کا نہایت پرزور انداز میں اعلان کر دیا کہ علم کو سینہ بہ سینہ نہیں بلکہ کھلم کھلا ہونا چاہیے، تاکہ اس کی تحصیل ہر آدمی کے امکان میں ہو، پڑھنا پڑھانا ہر انسان کا مسلم حق ہو، امیر کا بھی، غریب کا بھی، برہمن کا بھی شودر کا بھی، اسرائیلی کا بھی، غیر اسرائیلی کا بھی، عربی کا بھی، عجمی کا بھی، اِقْرَأْ کا مطالبہ اس لیے ہوا تھا کہ تحریر و کتابت کی ضرورت و اہمیت دنیا پر روشن ہوجائے، اور علم کو سینوں سے نکال کر کتابوں کی شکل میں آگے بڑھانے کی راہ کھلے، یہ ہے اسلام کا اولین اعلان، یہ اعلان انسانی تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ ہے، نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ تمام انسانوں کو اس پر زیادہ سے زیادہ فخر کرنا چاہیے[۳]۔

مسلمانوں کا سارا علم، بلکہ اسلام کی ترویج و اشاعت، قرآن مجید کے اثرات اور اس کی

۱؎ عبدالرزاق ملیح آبادی: العلم و العلماء ص ۶ ۲؎ ایضاً ص ۷ ۳؎ ایضاً ص ۳۰۔

تعلیمات کی دین ہے، اس پر بھی ہمیشہ مغربی مفکرین نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں نے علم یونان سے یا دوسرے عجمیوں سے سیکھا، حالانکہ مسلمانوں کی دینی تحریک قرآن مجید ہی سے ابھری۔[1]

علم کے ذرائع انسان خدا کی معرفت کو اس کی حکمتوں اور اس کی قدرت کے شواہد سے حاصل کر سکتا ہے اور اس کی حکمتوں کا علم تحقیق و تجربہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔

قرآن کی رو سے علم کلیت کا حامل ہے، یعنی انسانوں کو حواس و مشاہدہ، تخیل و تعقل، تجربہ و کشف اور الہام سب طریقوں کے اجتماع سے علم حاصل ہو سکتا ہے، صرف حواس، صرف عقل یا صرف تجربہ کافی نہیں۔[2]

علم کا ایک راستہ الہام بھی ہے، جسے وجدان یا تلقی بالغیب بھی کہا جاتا ہے، نیز علم کا ایک ذریعہ رویائے صادقہ بھی (شاہ ولی اللہؒ اس فکر کے حامل ہیں) قرآن کی رو سے علم معرفتِ خداوندی کے علاوہ عمل بھی ہے، علم کے ساتھ اعمال صالحہ لازم و ملزوم ہیں، علم کا مقصد خدا کی معرفت، تزکیۂ نفس اور اجتماع انسانی کی تہذیب ہے، نیز اس سے مشاہدۂ کائنات، اشیاء کی تحقیق و جستجو اور خدا کی حکمتوں کی دریافت بھی مقصود ہوتی ہے، خدا کا ارشاد ہے:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ	بیشک آسمانوں اور زمین کی خلقت
وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ	اور رات اور دن کے ایک دوسرے
لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ،	کے پیچھے آنے میں عقلمندوں کے لیے
الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ	نشانیاں ہیں، جو اللہ کو کھڑے، بیٹھے
قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ	اور پہلو کے بل لیٹے یاد کرتے ہیں، اور

[1] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ج ۱۳ ص ۴۸۹ [2] ایضاً ص ۴۸۹۔

يَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ	آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں
الْأَرْضِ. (آل عمران: ۱۹۱-۱۹۲)	غور و فکر کرتے ہیں۔

ماضی میں امتوں کی سعادت و شقاوت کے واقعات اور ان سے آیندہ کے لیے عبرتیں حاصل کرنا بھی علم صحیح کا ایک مقصد ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس کی طرف بار بار توجہ دلائی ہے اور جہاں تدبر و تعقل پر زور دیا ہے وہاں ایمان و یقین کو ساری زندگی کی بنیاد قرار دیا ہے، کلیت و سالمیت کے اسلامی اصول نے زندگی کے اجزاء کے بجائے اس کے کل کو مدنظر رکھا، یعنی ظاہر کے ساتھ باطن، حواس و تخیل کے ساتھ عقل و روح اور دنیا کے ساتھ آخرت۔

جغرافیائی عوامل اور محرکات ایک دوسرے پر ہمیشہ سے اثر انداز ہوتے چلے آئے ہیں حتیٰ کہ افکار و خیالات پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں،

اسلامی علوم کے اثرات اس کی جیتی جاگتی مثال اندلس کے اسلامی علوم میں ملتی ہے، اس کا پڑوسی ممالک پر بڑا گہرا اثر پڑا، نیز صلیبی جنگوں کی وجہ سے دو طرح کے مزاج، دو طرح کی تہذیبیں، اور دو قومیں جب باہم خلط ملط ہوئیں تو جن کے پاس علمی سرمایہ کی کمی تھی انھوں نے دوسروں سے استفادہ شروع کیا، کیونکہ علم سیکھنے سکھانے پر نہ کوئی روک تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔

چنانچہ اہل یورپ مسلمانوں کے اخلاق و اعمال کی برتری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، مذہبی اصلاح کے اسی جذبہ نے مذہبی انقلاب کی صورت اختیار کی، جس کا ظہور پروٹسٹنٹ مذہب کے نام سے ہوا، جس کا بانی مارٹن لوتھر تھا، جس نے قرطبہ اور طلیطلہ میں عربی فلسفہ اور علوم اسلامیہ کی تعلیم پائی تھی، اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسلام ہی کے مطالعہ سے لوتھر کو کیتھولک چرچ میں اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔[1]

[1] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ص ۴۹۶۔

یورپ میں نشأۃ ثانیہ کی ابتداء اسلامی علوم وفنون اور ان کے اسالیب فکر کی وجہ سے ہوئی اس کا اقرار The Making of Humanity کے مصنف برائی فالٹ نے کیا ہے[1]۔

عربی کے علوم وفنون کے اثرات کا عقلی اثر یہ ہوا کہ درایت کی رسم پڑی، بیکن کی مشہور کتاب Advancement of learning اسی فکر اور رجحان کی آئینہ دار ہے[2]۔ اندلس ہی کے راستے جب علوم وفنون یورپ پہونچنا شروع ہوئے تو ابن رشد سے اہل کلیسا کو بہت نفرت ہو گئی، اس لیے کہ ابن رشد سے لوگ استفادہ کرنے لگے تھے، اسی وجہ سے بار بار دینی کونسلیں منعقد ہوتی تھیں اور ابن رشد کی تصانیف اور تراجم پڑھنے پڑھانے کو بدترین کفر قرار دیتی تھیں، اس قسم کی آخری مجلس ۱۵۱۲ء میں بیٹھی تھی[3]، اسی قدر نہیں، سولہویں صدی عیسوی تک مذہبی تصویروں میں یہ دستور ہو گیا تھا کہ دجال اور شیطان کے ساتھ ابن رشد کی تصویریں بھی بنائی جاتی تھیں[4]، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن رشد نے اس دور کے اکثر حلقوں پر اپنا گہرا نقش چھوڑا تھا، جس کا اعتراف بعد کے مستشرقین نے بھی کیا، اور کہا کہ مسلمانوں کی علمی تحریک کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ یورپ میں طریقہ تجزیہ وتجربہ کا آغاز ہوا۔

اس دور میں مغربی سائنسداں کی معقولات کی تنقید وتشریح وتجزیہ کا سلسلہ مغربی علماء نے خود شروع کر دیا، اور تسلیم شدہ نظریات کی تردید وترمیم کی غرض سے کتابیں لکھی جانے لگیں[5]۔

مزید برآں ادھر مغرب میں اسلام کا مطالعہ قدرے وسیع القلبی سے ہونے لگا، اور اسلام کے علمی رویے کے حق میں گفتگو کرنے والے بہت سے مغربی علماء پیدا ہو گئے، مثلاً لیبان، ڈریپر، براؤن، مکلسن اور برائی فالٹ وغیرہ[6]۔

---

[1] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ص ۴۹۱ [2] ایضاً [3] عبدالرزاق ملیح آبادی: العلم والعلماء ص ۱۰۔ [4] ایضاً ص ۱۱۔ [5] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ج ۱۳ ص ۴۹۸۔ [6] ایضاً۔

مسلمانوں میں علوم کا از سر نو احیاء

ان مغربی علماء کی وجہ سے اسلامی دنیا پر بہت اچھے اثرات مترتب ہوئے اس لیے کہ اسلامی دنیا میں عام طور پر مرعوبیت کا رجحان پیدا ہو چلا تھا ان حضرات کی وجہ سے ان لوگوں کی مرعوبیت کم ہوئی اور اپنے ہی علوم وفنون کے مطالعہ سے جو بے رغبتی تھی وہ دور ہوئی، خود اسلامی علوم میں بھی بڑی کشش تھی جو فطرت، جدید سائنسی تجربات، علم الحیاۃ اور جدید طبعیات وغیرہ سے بالکل ہم آہنگ تھے۔

اس طرح مسلمانوں نے پھر سے غور وفکر اور نظر ومطالعہ کا آغاز کیا، اس سے پہلے مغرب کے سامنے کامل مغلوبیت کا دور تھا، یا مفاہمت کی معذرت خواہانہ کوشش تھی[1]۔

قوموں کو مفلوج کرنے کے طریقے

کسی قوم یا کسی ملک کو بالکل مفلوج کرنے کے لیے اس کی تہذیب، اس کی زبان، اس کا مذہب اس سے چھین لیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں پہلا اصول یہ ہے کہ اس کو بالکل جاہل رہنے دیا جائے، دوسرا اصول یہ ہے کہ معاش کے مسئلہ میں اس قدر پریشان حال رکھا جائے کہ وہ پڑھنے اور پڑھانے کی طرف مائل ہی نہ ہو، اور اگر بفرض محال پڑھنے کی طرف مائل بھی ہو تو اسے اس کی تہذیب وتمدن سے دور رکھا جائے اور اپنا نصاب تعلیم اور اپنے بنائے ہوئے اور متعین کیے ہوئے اصول اور تہذیب وتمدن سے اسے روشناس کرایا جائے، جس کی توجیہ یہ کی جائے کہ اس سے ملازمت ملے گی، اور دوسرے لوگوں کی طرح مساویانہ حقوق حاصل ہوں گے، غرض اسی طرح کی دوسری اچھی اچھی باتوں میں لگا کر اسے اس کی قومی تہذیب وتمدن اور مذہب سے بالکل بے بہرہ کر دیا جائے تو اس کا حال بالکل وہی ہوگا جو ماضی قریب میں مسلمانوں کا ہوا، اور جس کا رونا آج تک رویا جا رہا ہے، اور جس کی تلافی اب تک نہیں ہو پائی۔ بعض لوگ کسی قوم کو مفلوج بنانے میں سب سے پہلا سبب یہ سمجھتے ہیں

---

[1] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ص ۴۹۷۔

کہ اس کا اتحاد ختم کر دیا جائے، اور اس میں ایسی پھوٹ ڈال دی جائے کہ کبھی اتحاد ممکن ہی نہ ہو سکے،

بہر حال یہ دونوں اسباب اس امت میں موجود رہے، اور ان ہی دونوں اسباب کو دور کرنے کی مختلف اوقات میں اور مختلف دور میں کوششیں ہوتی رہیں۔

ہندوستان میں اصلاحی جد و جہد

برصغیر اور مشرق وسطیٰ میں چونکہ مسلمانوں کی آبادی بہت زیادہ ہے، اس لحاظ سے یہ مسائل یہیں سے شروع ہوئے، اور اسی خطے سے ان مسائل کو حل کرنے والے بھی نکلے۔

اسلام میں حرکت اجتہاد کی مرہون منت ہے، تاکہ اس مذہب کے اصول جو اگرچہ دوامی اور ابدی ہیں، ان تغیرات و احوال کا ساتھ دے سکیں جن کو قرآن شریف نے اللہ کی ایک بہت بڑی نشانی قرار دیا ہے، اور آیت قرآنی وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا نیز حضرت معاذ بن جبل رضؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد امت کی ایک مستقل ضرورت ہے۔

مسلمانوں کے پاس اجتہاد جیسا کارگر ہتھیار ہوتے ہوئے انھوں نے اس سے کام نہیں لیا، بلکہ اسے غیر ضروری ٹھہرا کر اپنے انحطاط اور زوال کا خود سبب بنے، اور دوسری طرف علم و عقل سے کام نہ لے کر مرعوبیت اور پستی کی طرف بڑھے، یہ صورت حال پورے عالمِ اسلام میں تھی، ہندوستان میں عالمگیرؒ نے فتاویٰ عالمگیریؒ کی تدوین کرا کر جس گرتے ہوئے اخلاقی، علمی اور سماجی نظام کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی وہ اس کے کمزور اور نااہل جانشینوں کے عہد میں منہدم ہو چکا تھا۔[1]

علامہ اقبالؒ نے اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مسلمانوں کے زوال کا ذمہ دار

---

[1] خلیق احمد نظامی: تاریخ مشائخ چشت حصہ پنجم ص ۴۱۶۔

بادشاہوں، علمائے سو اور صوفیائے خام کو بتایا ہے۔

بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مسلمانان ہند کی مذہبی اور اخلاقی حالت انتہائی زبون تھی، فکر و عمل، اخلاق و عادات، کردار و اطوار سب پر انحطاطی رنگ چھایا ہوا تھا، زندگی سمٹ کر سکر و دوام میں تبدیل ہو رہی تھی، اور ہر قوم کو سیاسی زوال سے پہلے اور اس کے بعد اخلاقی زوال کی جو منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں، وہ نہایت سرعت کے ساتھ طے کی جا رہی تھیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کا ارشاد گرامی ہے "سلطان کالروح است ہر سائر انسان کا بجسد اگر روح صالح است بدن صالح است، اگر روح فاسد است بدن فاسد است"۔ اورنگ زیبؒ کے جانشینوں کی اخلاقی حالت اور عوام پر اس کے اثرات دیکھ کر اس کلیہ کی حقیقت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے۔

اکبر کے زمانہ میں علماء کی اس دنیا پرستی کے خلاف حضرت مجدد صاحبؒ نے آواز اٹھائی تھی، اس دور میں حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان نے اس اہم کام کو انجام دیا، اس دور کے علماء عموماً یونانی علوم میں پھنسے ہوئے تھے، اور ان کا سارا وقت دور از کار بحثوں میں صرف ہوتا تھا اور قرآن شریف اور احادیث نبویؐ سے ان کا رابطہ تقریباً ٹوٹ چکا تھا، شاہ ولی اللہؒ اور ان کے متسلکین نے اس رجحان کے خلاف جنگ کی اور علماء کو اپنے فرائض یاد دلائے۔

الفوز الکبیر میں شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں: "یاد رکھو! علم یا تو قرآن کی کسی آیت محکم کا نام ہے یا سنت ثابتہ قائمہ کا"۔ یہ خاندان ولی اللّٰہی کا وہ زبردست اعلان اور کارنامہ تھا جس سے علم کے متعلق سارے ہندوستان کے نظریے بدل گئے، علوم دینی کے متعلق اس دور کے علماء اور شاہ صاحبؒ کے متبعین کے خیالات کی اساس و بنیاد اسی پر تھی۔

ویسے یہ دور ہندوستان ہی کے لیے نہیں، بلکہ تمام دنیا میں بھی ہر طرف بڑی اہم سیاسی سماجی اور فکری تبدیلیوں کے لیے یاد کیا جاتا ہے، عالم اسلام کی حالت کچھ زیادہ ہی غیر تھی، ایک طرف دولت عثمانیہ کا زوال ہو رہا تھا، تو دوسری طرف ایران میں انتشار اور ابتری کا دور دورہ تھا، ہندوستان میں بھی سلطنت مغلیہ بری طرح زوال کی طرف مائل تھی، فکری اور عملی نقطۂ نگاہ سے بھی پورے عالم اسلام کا رجحان پستی اور تنزل کی طرف تھا۔

جب شاہ ولی اللہؒ اس دور کے لیے رہنما بن کر نمایاں ہوئے تو اس کا سلسلہ بڑھتا ہی گیا، بلکہ پورے عالم اسلام میں ہر جگہ اللہ نے ایک نہ ایک رہبر اور مصلح پیدا کیا، جزیرۃ العرب میں محمد بن عبدالوہابؒ کو اور افریقہ میں محمد علی سنوسیؒ کو، ان حضرات کا فیضان ہی ہے کہ اس کے بعد یہ سلسلہ برابر جاری رہا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سر سید نے ہندوستان میں اور محمد عبدہٗ نے مصر میں باوجودیکہ ان کے کاموں میں بعض نقائص بھی تھے، لیکن تعلیم اور اصلاح کے نام سے امت مسلمہ کی بہت اہم خدمت کی۔

اس میدان کے نمایاں شہسوار ہم کو مولانا شبلی نعمانیؒ نظر آتے ہیں کہ دین کو جدید تعلیم اور جدید تقاضوں کو دین سے جوڑنے کی بہت ہی نمایاں کوشش کی، اور جن کی کوشش بہت ہی کامیاب اس معنی میں رہی کہ ان کی وجہ سے جس معاشرہ پر مرعوبیت کے بادل چھائے ہوئے تھے، وہ بالکل چھٹ گئے، اور مسائل کو اثباتی انداز میں سوچنے کی راہ ہموار ہو گئی، علی گڑھ کی تاریخ اور اس کی تحریک کو دینی رنگ میں رنگنے والے علامہ شبلیؒ ہی ہیں، مولانا شبلیؒ دینی اعتبار سے علی گڑھ کو کیا سبق دینا چاہتے تھے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے، ۱۸۹۲ء میں جب وہ ترکی گئے تو وہاں انھیں ایک کارخانہ میں جانے کا اتفاق ہوا، اتفاق سے اسی دوران ظہر کا وقت آگیا، اس وقت کوٹ پتلون میں ملبوس نوجوان ترک فوراً نماز کی تیاری میں لگ گئے، اس واقعہ کا

والہانہ انداز میں ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اگر مذہبی اثر سے آزاد ہو کر ترقی کریں تو ایسی ترقی سے تنزل ہزار درجہ بہتر ہے، اسی طرح کہتے ہیں کہ دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ آگے بڑھتے جائیں، آگے بڑھتے جائیں، لیکن مسلمانوں کی ترقی یہ ہے کہ وہ پیچھے ہٹیں یہاں تک کہ صحابہؓ کے دور سے مل جائیں۔

محمد علی جوہر کے اندر اسلام اور قرآن کا ذوق مولانا شبلیؒ کے درس سے پیدا ہوا جس کا اعتراف خود انھوں نے اپنی کتاب My life A Fragment میں کیا ہے۔

مولانا شبلیؒ نے جس زمانہ میں علی گڑھ میں قدم رکھا، یہ وہ زمانہ تھا کہ جب یورپ مسلمانوں پر سیاسی غلبہ حاصل کر چکا تھا، اس غلبہ کو مزید ذہنی تقویت پہونچانے کے لیے یورپ کے اہل قلم یہ طریقہ اختیار کیے ہوئے تھے کہ وہ مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے علوم کو بگاڑ کر مسلمانوں کے سامنے پیش کریں، مسلمان اب تک اپنی تاریخ پر ناز کرتے چلے آرہے تھے، اس کے جواب کے لیے مغربی مصنفین نے یہ کیا کہ اسلام، سلاطین اسلام اور علوم اسلامیہ کی طرح طرح کی برائیاں لکھ کر پھیلانا شروع کیا، تاکہ مسلمانوں کی نئی نسل خود اپنی قوم سے نفرت کرنے لگے۔

علی گڑھ کی فضا میں مولانا شبلیؒ کو اس فتنہ کا احساس ہوا، چنانچہ انھوں نے اپنے مضامین اور کتابوں، گفتگوؤں اور تقریروں میں ایسی اعلیٰ علمی سطح پر اس کا رد پیش کیا کہ مستشرقین کا سارا غبار چھٹ گیا۔

بہرحال مولانا شبلیؒ نے علی گڑھ پر اسلام کی تاریخ اور علمی عظمت قائم کی جس کا وہ اس وقت ضرور تمند تھا، اسی طرح ان کو علی گڑھ نے جدید کا عرفان دیا، جس کے نتیجے میں انیسویں صدی کے آخر میں اور بیسویں صدی کے آغاز میں وہ اسلامی شخصیت ابھر سکی جس کو مولانا سید سلیمان ندویؒ نے "عہد جدید کا معلم اول" کا لقب دیا ہے۔ (باقی)

تصوّف و سُلوک شاہ ہمدان کی تحریروں میں

از

پروفیسر سید وحید اشرف، شعبۂ فارسی مدراس یونیورسٹی۔

شاہ ہمدان امیر کبیر علی ثانی سید علی ہمدانی ۷۱۴ھ میں ہمدان میں ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوئے، لیکن بچپن ہی سے طبیعت فقر و درویشی کی طرف مائل تھی، بارہ ۱۲ سال کی عمر میں شیخ اخی علی دوسی (یا دوستی) سے علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل کی، اس کے بعد شیخ شرف الدین مزدقانی سے سلوک کی تکمیل کی[1]، اور اٹھارہ ۱۸ سال کی عمر میں خلافت و اجازت پائی، پھر ریاضت و مجاہدہ کرتے رہے، اور مرشد کے حکم سے عالم کی سیر کو نکلے اور وارد کشمیر ہوئے، ان کی تبلیغی مساعی اور روحانی برکات سے یہاں اسلام کی بہت ترویج و اشاعت ہوئی، انھوں نے بڑی تعداد میں تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، ان میں ایک ذخیرۃ الملوک ہے، جس میں بادشاہ وقت کو ہدایات دی ہیں، یہ کتاب کئی اعتبار سے اہم ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حقیقی صوفی عوام کی فلاح و بہبود، دنیا کی خوشحالی اور عدل و امن کے قیام سے غافل نہیں رہتا، بلکہ اپنی بساط کے مطابق وہ خدمت خلق کے لیے سعی و کوشش کرتا ہے، اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ خود ہی تجارت و زراعت وغیرہ کے کاموں میں لگ جائے، اس کی حیثیت معلم و مصلح کی ہوتی ہے، اس لیے وہ اپنی تعلیمات و ہدایات کے ذریعہ لوگوں کی اصلاح کرتا ہے[2]، کتاب سلیس انداز میں

---

[1] شیخ علی دوستی اور شیخ شرف الدین مزدقانی دونوں شیخ علاء الدولہ سمنانی (م ۷۳۶ھ) کے مرید و خلیفہ تھے (حالات کیلئے دیکھیے نفحات الانس جامی اور شیخ علاء الدولہ سمنانی از سید مظفر صمد[2]) دیکھیے راقم کی کتاب تصوف حصہ اول بعنوان تصوف اور کرنا

لکھی گئی ہے، اور اس میں اختصار و جامعیت سے کام لیا گیا ہے، اس لیے ادبی اعتبار سے بھی قابل توجہ ہے، حضرت سید علی ہمدانی کی جتنی تحریریں راقم کی نظر سے گذری ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادبی حسن نے بھی ان کو پُرکشش بنا دیا ہے، اور وہ بیان کے الجھاؤ، پیچیدگی اور غموض سے پاک ہیں، اختصار اور جامعیت ان کی اکثر تحریروں کا خاص وصف ہے، انداز بیان دلنشین ہے، ڈاکٹر محمد ریاض نے رسالہ فتوتیہ کے آغاز میں حضرت سید علی ہمدانیؒ کے ایک جملہ سے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ انھوں نے اپنے زمانہ کی سبک تحریر کی پیروی کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"سید علی ہمدانی در آغاز رسالۂ فتوتیہ خود می فرماید ... آنچہ زبان وقت املا کند در قلم خواہد آمد، و ایمای کردہ خواہد شد"۔ این نکتۂ عبارت نشان می دہد کہ سید علی در نگارشہائے خود بزبان وقت ہم توجہ داشتہ باشد، نگویا بہ سبک رائج و متداول زمان خود می نوشتہ است و سبک زبان او (قرن ہشتم) ہم طبقِ تحقیقات دانشمندان معاصر ایرانی و نیز آن طور کہ مطالعات این جانب حکایت می کند، بہ دو نوع بازبودہ: سادہ و مصنوع، و در آثار علی ہمدانی ہم ما ہمیں دو روش را دیدہ ایم (ص ۵۵)

لیکن یہاں زبان وقت سے مراد سبک رائج الوقت نہیں ہے، اس سے مراد وہ ہے جسے ہم آج کل اردو زبان میں فی البدیہہ یا برجستہ کہتے ہیں، مقصود یہ ہے کہ اس کے لکھنے کے لیے نہ کوئی تیاری کی گئی اور نہ کتابوں سے لکھتے وقت استفادہ کیا گیا، بلکہ جو کچھ لکھا گیا اس کا انحصار قوت حافظہ، فہم اور طبیعت کی آمد پر تھا، ذہن مختلف اوقات میں مختلف طریقوں سے کام کرتا ہے، ایک مخصوص وقت میں ذہن جس طرح کام کر سکا اس کو "زبان وقت" کہا ہے، اس دور میں اس کیفیت کے اظہار کے لیے محاورہ "زبان وقت املا کرد" ہی استعمال کرتے تھے، اس طرح کی متعدد مثالیں حضرت سید اشرف جہانگیرؒ کی تحریروں میں بھی ملتی ہیں، خصوصاً مکتوبات اشرفی میں، اس سے سید علی ہمدانیؒ کی وسعت معلومات، قوت حافظہ، علم مستحضر اور ذہن مرتب کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت سید علی ہمدانیؒ کے حالات کے بنیادی ماخذ دو ہیں: ایک مستورات، اور دوسرے خلاصۃ المناقب، جن سے بعد کے تاریخ نویسوں اور تذکرہ نگاروں نے استفادہ کیا ہے، ان کے علاوہ خود ان کی تحریروں میں کچھ اشارے ملتے ہیں، لیکن سید علی ہمدانیؒ کے بارہ میں دو اور ماخذ نہایت اہم ہیں: ایک لطائف اشرفی اور دوسرے مکتوبات اشرفی، اگرچہ اس میں شاہ ہمدان کے حالات نہیں ملتے، بلکہ صرف بعض احوال کا ذکر اور ان کے بارے میں حضرت سید اشرف جہانگیرؒ کی رائے ملتی ہے جو اس لیے نہایت اہم ہے کہ یہ ایک ایسی عظیم المرتبت روحانی شخصیت کی رائے ہے جس نے تقریباً تیس ۳۰ سال ان کے ساتھ سفر میں گذارے، اور علمی مرتبہ میں اپنے وقت کے اعلیٰ ترین عالموں میں تھے، تصوف میں ان کے بلند درجہ کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ صوفیہ کی اصطلاح میں غوثیت کے مقام پر فائز ہوئے۔ (حیات سید اشرف جہانگیرؒ)

ڈاکٹر محمد ریاض نے سید اشرف جہانگیرؒ کا ذکر کتاب "احوال و آثار و اشعار میر سید علی ہمدانی" میں کیا ہے، لیکن اس ضمن میں ان سے چند در چند غلطیاں ہوئی ہیں جس سے بہت سے قارئین میں غلط فہمی کا پیدا ہونا لازمی ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ "سید اشرف جزو مریدان شیخ قطب عالم نور الحق (م ۸۱۳ھ) در آمد" یہ درست نہیں، سید اشرف قطب عالم نور الدین کے والد شیخ علاء الدین (م ۸۰۰ھ) کے مرید و خلیفہ تھے، لطائف اشرفی، مکتوبات اشرفی، اخبار الاخیار اور صوفیہ کے بہت سے تذکروں میں یہ بیان موجود ہے۔

ڈاکٹر ریاض نے ایک جگہ سید اشرف کو سید علی ہمدانی کا مرید لکھا ہے۔

سید اشرف جہانگیر کی تاریخ وفات بھی مختلف لکھی ہے۔

صفحہ ۸۶ پر لکھتے ہیں: "وفاتش ظاہراً در سال ۸۲۹ھ اتفاق افتاد"۔ (بحوالہ تذکرہ صوفیۂ بنگال ص ۲۰۱ و ۳۱۰ و ۳۰۶)

صفحہ ۲۸ پر لکھتے ہیں "سید اشرف جہانگیر سمنانی متوفی در حدود ۸۳۵ھ" (بحوالہ تذکرہ صوفیہ بنگال، ص ۳۱۰)

صفحہ ۳۱ پر لکھتے ہیں: "ہمیں طور شیخ سید اشرف جہانگیر سمنانی کہ بعض از سفرہا در معیت میر سید علی ہمدانی بودہ، و آخر الامر در بنگالہ توطن گزیدہ، و در سال ۸۰۸ھ در ہماں جا وفات یافتہ"۔ (بحوالہ تذکرۂ صوفیۂ بنگال، ص ۲۱۶، ۳۰۹، ۳۱۰)

سید اشرف جہانگیرؒ کی وفات کی تین تاریخیں مندرج کی ہیں، اور تینوں مختلف ہیں، اطلاعاً تاریخ وفات کا ماخذ ایک ہی کتاب "تذکرۂ صوفیۂ بنگال" ہے، مؤلف نے ان مختلف تاریخوں کو بے چون و چرا قبول کر لیا، جبکہ ظاہر ہے کہ وفات کی ایک ہی تاریخ ہو سکتی ہے۔

صفحہ ۸۶ پر مؤلف کا بیان عجیب و غریب ہے، یعنی وفاتش ظاہراً در سال ۸۲۹ھ اتفاق افتادہ، یہاں لفظ "ظاہراً" تحیر خیز ہے، لطائف اشرفی کے کسی نسخہ میں اور کسی تذکرہ نگار نے (راقم الحروف کو چھوڑ کر) یہ تاریخ وفات نہیں لکھی ہے، تاریخ صوفیۂ بنگال میں اگر اسی طرح لکھا ہے تو تعجب خیز ہے، ظاہراً تو ۸۰۸ھ تاریخ وفات ہے، جیسا کہ تمام تذکروں اور لطائف اشرفی کے اکثر نسخوں میں ہے، اس لیے ظاہراً تو ۸۲۹ھ کہیں نہیں ہے، ظاہراً کا مفہوم تو یہ ہے جسے ہر شخص آسانی سے دیکھ اور سمجھ سکتا ہے، اس کے خلاف لکھنے کے لیے تحقیق کے ساتھ دلائل دینے ہوں گے، ورنہ پھر جو ظاہر ہے اسی کی پیروی کرنی پڑے گی، راقم الحروف نے مجلہ معارف اعظم گڈھ کے شمارہ مارچ ۱۹۶۶ء میں اس موضوع پر تحقیقی بحث کی تھی، جو بعد میں راقم ہی کی کتاب "حیات سید اشرف جہانگیرؒ" مطبوعہ ۱۹۷۵ء میں شامل کر لی گئی۔

صفحہ ۸۶ پر سید اشرفؒ کو جہانگیر یا جہاں گرد لکھا ہے، پھر مؤلف نے اپنے اندازے سے یہ توجیہ کر دی ہے: "زیرا از سیاحانِ بزرگِ عالمِ تصوف است"۔

سید اشرف جہانگیرؒ کا لقب جہانگیر ہے، یہ لقب انھیں اپنے پیر و مرشد سے ملا تھا، اسی لیے انھوں نے اس کو بخوشی قبول کر لیا، اور بطور تحدیث نعمت اسی کا اظہار کیا، واما بنعمۃ ربک فحدث۔ جہانگیرؒ کے معنی صوفیہ کی اصطلاح میں "قطب وقت" ہے۔

سید اشرف جہانگیر کے بارے میں مؤلف نے صفحہ ۱۹۱ پر یہ لکھا ہے: "بعدًا در جنوب ہند توطن گزیدہ است"۔ اور صفحہ ۱۳۷ پر لکھا ہے: "در بنگالہ توطن گزیدہ"۔ اور دونوں بیان کا ماخذ کتاب تاریخ صوفیۂ بنگال بتایا ہے۔

سید اشرف جہانگیرؒ نے اپنے مرشد کے حکم سے کچھوچھہ کو اپنا مستقر بنایا تھا، جو اس وقت جون پور میں تھا، آخر یہی جگہ ان کی آخری آرامگاہ بنی جو آج بھی مرجع خلائق ہے۔ فیض آباد گزیٹر میں اس موضع کا پورا نام اشرف پور کچھوچھہ ہے، لیکن ایک عرصہ سے صرف کچھوچھہ کے نام سے معروف ہے۔

سید اشرف جہانگیر سید علی ہمدانیؒ کے بارے میں ایک مستند شاہد ہیں، ایسے بلند مرتبہ شاہد کے بارے میں مجہول بیانات بہت سے شکوک و شبہات کا باعث ہو سکتے ہیں، سید اشرف جہانگیرؒ کے بارے میں جدید ترین مستند تحقیقات جن لوگوں تک پہونچ سکی ہیں اُن پر ان مجہول بیانات کا اثر تو نہیں پڑ سکتا، لیکن ظاہر ہے بہت سے دوسرے لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں، اس لیے اس موقع پر ان اشتباہات کی نشان دہی کرنا ضروری محسوس ہوا۔

اس تمہید کے بعد ہم اپنے موضوع پر آتے ہیں، تصوف کی اساس محبت ہے، خدا سے محبت، خدا کے برگزیدہ بندوں سے محبت، اور خدا کی تمام مخلوق سے محبت، اس لیے تمام صوفیہ نظریۂ محبت پر عمل پیرا ہوتے ہیں، البتہ جن لوگوں نے تعلیمات تصوف پر لکھا ہے انھوں نے اپنے زمانہ کا بھی لحاظ رکھا ہے، یعنی سماج کے جس پہلو کو زیادہ کمزور پایا اس پر کچھ خصوصی توجہ دی،

شاہ ہمدان بھی اسی جذبۂ محبت کو تصوف کی اساس قرار دیتے ہیں، اور خدا سے عشق کو تصوف کی روح قرار دیتے ہیں، لیکن وہ اس عشق و محبت کے مقام تک پہونچنے کے لیے محبت اہل بیت کو خاص وسیلہ قرار دیتے ہیں، محبت اہل بیت سبھی صوفیہ کے لیے لازم ہے، لیکن شاہ ہمدان نے اس موضوع کو خصوصیت کے ساتھ اپنی تحریروں میں اہمیت دی ہے، وہ کہتے ہیں کہ حُبِ اہل بیت اور خصوصًا حُبِ علیؓ کے بغیر سارے اعمال بے سود ہیں، اس محبت کے بغیر بندہ قرب خداوندی سے محروم رہتا ہے، ایک رباعی میں وہ صاف لکھتے ہیں:

گر مہر علیؓ و آل[1] بتولت نبود — امید شفاعت از رسولت نبود
گر طاعت حق جملہ بہ آوردی تو — بے مہر علیؓ ہیچ قبولت نبود

(ص ۴۸۱)

ایک جگہ کہتے ہیں کہ خدا اور رسول تک میری رہبری کرنے والے علی رضی اللہ عنہ ہیں:

علی ہمام را بنگر کہ جز او — بہ اللہ و محمدؐ رہبرم نیست

(چہل اسرار)

شاہ ہمدان لکھتے ہیں کہ اگرچہ خدا کی اطاعت اور اپنے نفس کی مخالفت ہی اسلام کی حقیقت ہے، لیکن حبِ اہل بیت ہی تمام سعادتوں کی کنجی ہے، اور جب سعادت نصیب

[1] ڈاکٹر محمد ریاض نے "و آل" لکھا ہے، ممکن ہے یہ کاتب کا تصرف ہو جو باقی رہ گیا، اس صورت میں قابل شمار حروف کی تعداد اکیس[21] ہو جائے گی اور مصرع رباعی کے وزن سے خارج ہو جائے گا، کیونکہ رباعی کے ہر مصرع میں قابل شمار حروف کی تعداد بیس[20] ہونا چاہیے، "وال" میں واؤ عطف ہے اور آل (اال) ہے ایک الف ساقط ہو گیا تو ال ہوا اور واؤ عطف مل کر وال ہو گیا، اور مفہوم آل ہی رہے گا یعنی وال اصل میں وآل ہے، شعر میں درمیان کے الف کو ساقط کرنا جائز ہے، قابل شمار حروف کی تعداد بیس[20] رہے گی، جو رباعی کے وزن کی خصوصیت ہے۔

ہوتی ہے تو خدا بندے کو کسی ایسے مرشد سے ملا دیتا ہے جس کی صحبت کیمیا تاثیر ہوتی ہے، جس کی وجہ سے اس کے باطن کو صفائی میسر ہوتی ہے، ورنہ اس کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ راہِ حق اس پر بند ہو جاتی ہے، اور اس کا باطن حرص و حسد کا آماج گاہ بن جاتا ہے، لکھتے ہیں:

"نشان بے دولتی دادبار مرید آنست کہ سایۂ خذلان حضرت ایزدی ویرا بہ مدبری از راہزنان تسویلات باطلہ و مزخرفات فاسدہ راہ حق براو مسدود گرداند و خار بدعت و ضلالت در راہ او نہد و تخم دنارت ہمت و خساست در دل او می اندازد، و باطن او را بہ نجاست حرص و حسد ملوث می گرداند، ولیس الخبر کالمعاینۃ" (درویشیہ ص ۴۹۳)

اس مسئلہ کی طرف سید علی ہمدانیؒ نے اس لیے خصوصی توجہ دی ہے کہ ان کے زمانے میں معاشرہ جاہل اور بد باطن پیروں کی وجہ سے سخت فساد میں مبتلا تھا، صوفیہ کے نزدیک چنگیز و ہلاکو کے زمانہ میں ایران میں غارتگری کا سبب یہی فساد معاشرہ تھا، لیکن اس کے بعد معاشرہ فوراً درست نہ ہو سکا، بہت سے علاقوں میں بعض بدترین اخلاقی خرابیاں موجود تھیں، معاشرہ کی اس خرابی کا خاص سبب علمائے سو اور پیران بد باطن تھے جن کا مقصد محض جلب منفعت اور دنیاوی مفاد تھا، اس کا کچھ اندازہ کتاب مناہج الطالبین و مسالک الصادقین تالیف نجم الدین محمود بن سعد اللہ اصفہانی سے ہوتا ہے۔ (ص ۲۸۰ تا ۲۹۳)

سید علی ہمدانیؒ کو اپنے معاصر ایران کا تجربہ تھا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ان کے دور میں بھی بد باطن پیروں اور علمائے سو کی کمی نہ تھی، اس کا ثبوت خود اس واقعہ سے ملتا ہے جبکہ بلخ میں علمائے سو نے سازش کر کے ان کو صرف اس لیے زہر دے دیا کہ ان کی وجہ سے انہیں اندیشہ ہو گیا تھا کہ بلخ کے علماء کی دنیاداری کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے، سید علی ہمدانیؒ نے خود اپنے زمانے کے عام پیروں کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

"اس زمانے کے پیروں اور مریدوں کے حال پر نظر ڈالو، تاکہ تم دیکھو کہ کس طرح مکر و فریب کی دوکان رکھنے والے شیاطین اپنے کو فقر کے سلاطین کہتے ہیں، بدبختوں نے اولیاء کا لباس پہن رکھا ہے، مردود لوگ اپنے کو برگزیدہ بندوں کی طرح ظاہر کرتے ہیں، راہزن دین کے لٹیرے ارباب دین کا ڈھونگ رچاتے ہیں، ان کا طریقہ زندقہ و الحاد اور مکر و فساد ہے، ان کا وجد ظاہر کرنا محض مکاری ہے، اور یہ صرف رقص و بازی ہے، ان کی صحبت میں بدعتی اور بے نمازی داخل ہیں، ان کی مجلس کی زینت جنگ و جدال ہے، ان کی خلوتوں میں خباثت اور بھنگ ہوتی ہے، ان کو حرام کی روزی اور گدائی پر فخر ہے، بے حیائی اور بے شرمی پر ان کو ناز ہے، جاہل عوام جو کالانعام ہوتے ہیں، وہ ان گمراہ لوگوں کے مکر و فریب میں مبتلا ہو گئے ہیں، اور ان بد نصیب جھوٹوں کی شیخیوں کو اپنی نفسانی خواہشات کا مددگار بنا لیا ہے، اور اباحت اور کفر کو طریقت اور فقر کا نام دے رکھا ہے، اور دین و اسلام کے حقائق سے بیگانہ ہیں، قیامت میں اللہ جل شانہ حاکموں، قاضیوں اور ائمۂ اسلام سے اس فساد کے دفع کرنے میں تساہل اور تقصیر پر باز پرس کرے گا، کیونکہ اسلام کے قواعد کے استحکام اور اہل بدعت و ضلال کے قلع قمع کرنے کی ذمہ داری سلاطین و حکام پر ثابت ہے، اور حدودِ شرع کی رعایت ان پر واجب ہے، لیکن چونکہ اس زمانے میں سلطنت کے امور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں جو امور دین کے اسرار سے جاہل ہیں، اور ان کی ساری توجہ لہو و طرب میں مبذول ہے، اور فسق و فجور کو اپنا مذہب بنا لیا ہے، اور ظلم و فساد کو اپنا اصول بنا لیا ہے، اور فاسقوں اور فاجروں کی صحبت سے یہ لوگ اُنس حاصل کرتے ہیں اور دنیائے مُردار و فانی کو اپنی جنت سمجھتے ہیں، اور نفس و ہوس کے بندے بن گئے ہیں اور شیطان کی شاگردی پر جان سے آمادہ ہیں اور خدا اور رسولؐ کے فرمان کو پسِ پُشت

ڈال رکھا ہے، حاکموں، قاضیوں، معلموں اور مفتیوں سب نے اختلافی جھگڑوں اور کلامی بحثوں کا نام علم دے رکھا ہے، اور منطقی و فلسفی خرافات کو اپنی شہرت وجاہ کا وسیلہ بنا رکھا ہے، اور علوم دین کے حقایق جو کتاب وسنت کے اسرار ودقایق کی معرفت پر مبنی ہیں، ان سے اعراض کر رکھا ہے، اس لیے بدعتی گمراہان ہر طرف پھیل گئے ہیں، اور بے دین زندیقوں نے قوت پیدا کرلی ہے، اور اسلام کے حدود واحکام کی روشنی بجھ گئی ہے، اور شریعت محمدیؐ کے ماننے کی مامونیت ختم ہورہی ہے، اور اہل اللہ اور اربابِ قلوب اُن پُرمعاصی نام نہاد مسلمانوں کی شرم سے اور ان لوگوں کی وحشت سے جن کی صورت درویشوں کی اور کام شیطانوں کے ہیں، مخلوق کی نظر سے پوشیدہ ہوگئے ہیں، اور غیرت سے گوشہ نشینی اختیار کرلی ہے، اور اس مصیبت کے غم میں زندگی بسر کر رہے ہیں"

(رسالۂ درویشیہ ص ۴۹۳)

حب اہل بیت اور شیخ برحق کی رہبری کے بعد ذکر کو اہمیت دی گئی ہے، لیکن ذکر کی برکات سے مستفید ہونے کے لیے علم وعقل کی بھی ضرورت ہے، معرفت بقدر عقل ہوتی ہے، حضرت سید علی ہمدانی کہتے ہیں کہ دین کی اساس عقل ہے، اور عقل ہی طاعات کی اصل ہے، لکھتے ہیں:

"دین کی بنا عقل ہے، اور حدیث میں ہے کہ ایک دن رسول اللہ کے سامنے کسی کی صفت بیان کی گئی کہ وہ بہت عبادت کرتا ہے، رسول علیہ السلام نے پوچھا کہ اس کی عقل کیسی ہے؟ کیونکہ تمام عبادتوں کی اصل عقل ہے۔" (ذکریہ ص ۵۴۱)

لیکن عقل کے ساتھ بندہ جب تک عشق الٰہی سے سرشار نہ ہو، خدا تک رسائی نہیں ہوسکتی

آنکہ با عقل طلب کرد ہمہ عمر نیافت   وآنکہ بے خویش درآمد بیکے لحظہ رسید

(چہل اسرار ص ۴۶۲)

ذکر، فکر اور مراقبہ وغیرہ اسی وقت سودمند ہوسکتے ہیں جب شریعت کی مکمل پابندی کی جائے:

بے امتثال امرش چشم امید مگشائے   مرد آں بود کہ دارد بر دیدہ مہر فرماں

(چہل اسرار)

ارادت کی حقیقت یہ ہے کہ سالک کی مرضی خدا کی مرضی میں گم ہوجائے، تسلیم ورضا اس کا شیوہ بن جائے، اور احساس انا کا خاتمہ ہوجائے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوکون سے بے نیاز ہوجائے، اور غیر کا نقش اس کے دل سے مٹ جائے، رسالہ ذکریہ ص ۵۳۴ میں لکھتے ہیں:

"ارادت کی حقیقت یہ ہے کہ تمہارا ارادہ خدا کے ارادہ میں گم ہوجائے، اگر تمہارا ایک ذرہ بھی ارادہ باقی رہا تو تم خود پرست رہوگے، جب تک خود پرستی نہیں چھوڑوگے خدا پرست نہیں بن سکتے، بندہ بنے بغیر اپنے ارادہ سے آزاد نہیں ہوسکتے، جب تک دونوں عالم سے کنارہ کشی نہ اختیار کروگے آدم اور آدمیت کے مرتبہ کو نہیں پہونچ سکتے، اور جب تک خود اپنے سے گریز نہیں کروگے خدا تک نہیں پہونچ سکوگے، جب تک خود کو فنا نہیں کروگے آنحضرت کے مقبول نہیں بن سکوگے، اور جب تک سراپا نیاز نہیں بنوگے اس وقت تک سب کچھ نہیں بن سکتے، اور یہ مقام تجرید ظاہر اور تفرید باطن کے بغیر ہاتھ نہیں آسکتا، یہی تمام مشاغل سے اعراض کا مطلب ہے، کیونکہ تجرید وتفرید جب تک سالک کا وصف نہ بن جائے، اس وقت تک شجرۂ ارادت سے توحید کا ثمر ظہور میں نہیں آسکتا، اور جب تک غیر کیلئے باطن میں کوئی جگہ رہے گی توحید کا راز لوح دل پر نقش نہیں ہوسکتا۔"

عقل، عشق، اتباع شریعت، شیخ کامل کی رہبری، تجرید وتفرید (یعنی تمام دنیا سے بے نیاز

ہوجانا اور صرف خدا کی رضا کو اپنا شیوہ بنالینا) سلوک کے ان پانچ بنیادی امور کے حصول کے بعد سالک سلوک کی منزلیں طے کرسکتا ہے، لیکن تجرید وتفرید کا یہ مطلب نہیں ہے کہ گوشہ نشین ہوکر مخلوق سے بالکل چشم پوشی کرلے، اور ان کے دکھ درد سے غافل ہوجائے، البتہ ایک مبتدی کے لیے عزلت ہی بہتر ہے، تاکہ اس کے اندر یہ قابلیت پیدا ہوجائے کہ دنیا کے فریب میں مبتلا نہ ہوسکے، حضرت شاہ ہمدان لکھتے ہیں کہ وہ صاحب فتوت ہے جو مخلوق کی خدمت صرف رضائے الٰہی کے لیے کرتا ہے، اور اس کا وجود دوسروں کے لیے باعث راحت و رافت ہوجاتا ہے، رسالۂ فتوتیہ (ص ۳۵۳) میں صاحب فتوت کے متعلق لکھتے ہیں:

"ایشاں را بخلق گردانیدہ اندو دلہائے ایشاں را مہبط رحمت و رافت کردند، و وجود ایشاں را سبب راحت و آسایش بندگان خود ساختند"

رسالۂ فتوتیہ (ص ۳۷۹) میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک قول نقل کرتے ہیں:

أركان الفتوة أربعة: العفو	انتقام کی قدرت کے باوجود معاف کردینا
مع القدرة، والحلم فی	حالت غضب میں بردباری، دشمن کے
حال الغضب والنصيحة	ساتھ بھی نیک سلوک اور اپنی ضرورت
مع العدا و هو الإيثار مع الحاجة	کے باوجود ایثار کردینا۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ان چاروں چیزوں کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اس لیے بندوں کے حقوق سے چشم پوشی کرکے کوئی صاحب فتوت نہیں ہوسکتا، ایک جگہ صاحب فتوت کی سیرت کا نقشہ کھینچا ہے، اور کہا ہے کہ اسے خصائل پسندیدہ سے آراستہ ہونا چاہیے، اور پھر خصائل پسندیدہ کی تشریح کی ہے، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ صوفی اہل دنیا سے بے تعلق نہیں ہوجاتا۔

"اے عزیز! صاحب فتوت کو چاہیے کہ اخلاق کی خوبیوں سے متصف اور پسندیدہ خصلتوں سے آراستہ ہو، پسندیدہ خصلتیں یہ ہیں: بوڑھوں کا ادب، جوانوں کو نصیحت، بچوں پر شفقت، کمزوروں پر رحمت، درویشوں کے ساتھ سخاوت، علماء کی توقیر و عظمت، ظالموں کی اعانت سے دوری، فاجروں کی صحبت سے پرہیز، خلق کے ساتھ احسان و مروت، خالق کے سامنے تضرع و تسلیم، نفس کے ساتھ جنگ، خلق کے ساتھ صلح، خواہشات نفسانی کی مخالفت، شیطان سے محاربت، مخلوق سے جفا اٹھانے پر بردباری، دشمنوں کے مقابلہ میں حلم، مصیبتوں پر صبر، امید و بیم کی حالت میں شکر، اپنے عیوب پر اطلاع دوسروں کے عیوب کے ذکر سے خاموشی، مخلوق کی مصیبتوں اور دکھ درد کا احساس، خدا کی رضا پر راضی، بدعت و ہواسے دوری، شریعت کی پابندی، طریقت پر ثابت قدمی تہمت کی جگہوں سے بچنا، اس علم کی طلب جو ذریعۂ نجات ہے، اہل غفلت سے وحشت سفر میں طاعت کے لیے ساتھیوں کی مدد کرنا، جماعت کی پابندی، ظالموں کو نصیحت، تھوڑے مال و متاع پر قناعت، آخرت کی فکر، اپنے اعمال کا خوف، قیامت کے دن کی رسوائی سے ڈرنا اور خدائے تعالیٰ کے فضل و کرم کا امیدوار رہنا" (رسالۂ فتوتیہ ص ۳۶۳)

حضرت ہمدانی رسالۂ ذکریہ میں لکھتے ہیں کہ ارباب طریقت نے سلوک کے چار ارکان بتائے ہیں، وہ یہ ہیں:

(۱) باب اول طہارت لقولہ تعالیٰ: إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ،

(۲) باب دوم توبہ، لقولہ تعالیٰ: إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ،

(۳) باب سیوم توکل لقولہ تعالیٰ: إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ

(۴) باب چہارم عقل لقولہ تعالیٰ: إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ،

پھر کہتے ہیں کہ ان میں سے ہر باب کا ایک ظاہر ہے، اور ایک باطن، اس طرح سلوک کے آٹھ شرائط ہیں، جن کا ذکر حضرت جنید بغدادیؒ نے کیا ہے، رسالۂ ذکریہ میں ان آٹھ شرائط کا بیان بہت اختصار سے کیا گیا ہے، چونکہ یہ بہت مختصر ہے اس لیے ان کا ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:

"باب اول طہارت ہے، اس کے دو حصے ہیں، ایک ہمیشہ باوضو رہنا، اور دوسرے ہمیشہ ذکر میں مشغول رہنا، وضو ظاہری پاکی ہے جو اعضاء کو گندگی سے پاک کرتی ہے، اور ذکر باطنی پاکیزگی ہے جو آئینۂ دل کو کدورتوں سے اور اغیار کے زنگ سے پاک کرتا ہے"

"باب دوم توبہ ہے، اس کے دو حصے ہیں، ایک ہمیشہ خاموش رہنا، اور دوسرے دل کو خطرات سے پاک رکھنا، خاموشی ظاہری امر ہے کہ زبان کو غیر کے ذکر سے محفوظ رکھے، اور نفی خواطر کا تعلق باطن سے ہے کہ دل کو غیر کی یاد کے خطرے سے محفوظ رکھے۔"

"باب سیوم توکل ہے، اس کے دو حصے ہیں، ایک ہمیشہ خلوت میں رہنا، اور دوسرے ہمیشہ روزہ رکھنا، خلوت اور تنہائی ظاہری امر ہے، جس کا مقصد ظاہری حواس کو افتادِ پراگندگی اور تردد سے محفوظ کرنا ہے، اور روزہ باطنی جزو ہے جس کا مقصد نفس کے اشتہا کو کم کرنا ہے۔"

"باب چہارم عدل ہے، اور اس کا ایک حصہ اپنے دل کو شیخ کی روحانیت سے مربوط رکھنا ہے، اور دوسرا حصہ کبھی کسی پر اعتراض نہ کرنا ہے، شیخ سے دل کا ربط ظاہری جزو ہے، تاکہ توجہ کے وقت روحانیت شیخ سے استفادہ کر سکے، اور حق تعالیٰ پر ترکِ اعتراض کا تعلق باطن سے ہے، تاکہ سالک کا دل حق کے ساتھ مقامِ رضا پر پہونچ سکے، اور اس کو یہ یقین حاصل ہو جائے کہ جو کچھ حکیم مطلق کرتا ہے اسی میں مصلحت ہے۔"

(باقی)

سینما ہے یا صنعتِ آذری ہے؟

(اقبال کی نظم "سینما" قرآن اور احادیث کی روشنی میں)

از

جناب محمد بدیع الزماں، ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔ پٹنہ

اس مضمون کا عنوان اقبال کی درج ذیل نظم "سینما" سے ماخوذ ہے جس کا تجزیہ قرآن اور احادیث کی روشنی میں کیا جانا مقصود ہے:-

وہی بت فروشی وہی بت گری ہے — سینما ہے یا صنعتِ آذری ہے؟
وہ صنعت نہ تھی شیوۂ کافری تھا — یہ صنعت نہیں شیوۂ ساحری ہے
وہ مذہب تھا اقوامِ عہدِ کہن کا — یہ تہذیبِ حاضر کی سوداگری ہے
وہ دنیا کی مٹی یہ دوزخ کی مٹی!
وہ بتخانہ خاکی یہ خاکستری ہے (بالِ جبریل)

اب جب کہ ہمارے قدم اکیسویں صدی عیسوی میں داخل ہونے کے لیے اس کی دہلیز تک جا پہنچے ہیں "سینما" جیسے موضوع پر قلم اٹھانا اور وہ بھی قرآن اور احادیث کی روشنی میں بالکل بے تکی اور بے وقت کی شہنائی ہی کہی جائے گی۔ اس لیے بھی کہ اب پانی سر سے اونچا ہی نہیں ہو چکا ہے بلکہ ڈبو کر منجدھار میں غوطے بھی کھلا رہا ہے۔ بے تکی اور بے وقت

کی تنہائی اس لیے کہ اولاً اس مضمون کے عنوان ہی سے "روشن خیال طبقہ" اور "تہذیب حاضر کے گرفتاروں" کی جبینوں پر گہری شکنیں پڑ جائیں گی اور دوم اس لیے کہ اگر بے وقت کی تنہائی ہی بجا ٹھہرا تو اس کے لیے "معارف" جیسے مجلّہ کا انتخاب کیا جانا اور اس کے قیمتی صفحات سیاہ کیا جانا اور بھی بے تکی سی بات ہوگی۔ "معارف" جیسے مجلّہ کی علمی، ادبی و دینی عظمت و اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا محمد علیؒ جیسے مجاہد نے بیتول جیل میں، دورانِ اسیری اس رسالہ کی پانچ چھ سال کی جلدیں کلکتہ کی اپنی رہائش گاہ سے صرف اس لیے منگوائی تھیں کہ انہیں محفوظ کرنے کے لیے ان کی جلد بندی کرا دی جائے جس کا ذکر انھوں نے اپنے خط مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۱۹ء میں بنام علامہ سید سلیمان ندویؒ کیا ہے اور جو مکتبہ جامعہ دہلی کا شایع کردہ "خطوط محمد علی" میں شامل ہے۔ اس کی اس عظمت اور اہمیت کی وجہ سے اس مضمون کی اشاعت اسی مجلّہ میں کی جانی مناسب سمجھی گئی۔ تاکہ سینما کے معاملہ میں اقبال کیا کچھ اور کیوں کہنا چاہتے تھے اس پر سنجیدگی سے غور کیا جا سکے۔

مجھے اس موضوع پر قلم اٹھانے کی ہمت کچھ اس لیے بھی ہوئی کہ اگر "سینما" جیسی نظم کسی عالم دین کی فکر کا مظہر ہوتی تو عام طور پر یہی تاثر لیا جاتا کہ چونکہ انھوں نے دین ہی کا علم حاصل کیا ہے اس لیے ان کے لیے لازمی طور پر زندگی اور معاشرہ کے ہر پہلو کا جائزہ قرآن اور سنت کی روشنی میں لیا جانا ایک فطری سی بات ہے کیونکہ دین کا علم حاصل کرنے کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ "تواصوا بالحق" پر عمل کیا جائے۔ مگر جب ایسی نظم اقبال جیسے شخص کے قلم سے نکلے جنھوں نے اپنے متعلق یہ کہا ہے کہ: "میں نہ عارف نہ مجدد نہ محدث نہ فقیہہ" تو انگشت بدنداں رہ جانا پڑتا ہے اس لیے کہ انھوں نے کبھی کسی دینی ادارہ میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی بلکہ یورپ تمام دنیا کی سب سے اعلیٰ ترین یونیورسٹیوں میں اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کی تھیں اور ان جیسی اتنی غیر ملکی ڈگریاں رکھنے والے اس وقت یعنی (۱۹۰۸ء) کے غیر منقسم ہندوستان

(جس میں آج کا پاکستان، بنگلہ دیش اور برما شامل تھا) میں انگلیوں پر گنے جاتے تھے۔ اس زمانہ میں جو بھی یورپ سے تعلیم حاصل کر کے واپس آتا تھا اس پر مغربی تہذیب، تمدن اور کلچر کی اتنی گہری چھاپ پڑ جاتی تھی کہ اس کے لیے دین مردم شماری کی غرض کے علاوہ کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا جس کا مذاق اکبر الہ آبادی نے ساری زندگی اپنے کلام میں اڑایا اور یہی رونا روتے رہے کہ ؎

ترقی پاتے ہیں لڑکے ہائے نورِ دیں کھو کر
یہ کیا اندھیر ہے بجھ جاتے ہیں تب چمکتے ہیں

مگر گمراہوں کے اس جم غفیر سے ہٹ کر دور بیٹھا اقبال، ہاتھ میں "قل ھو اللہ" کی شمشیر لیے زبان سے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۸۱ : "وقل جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا" پڑھتا ہوا ہر باطل پر کاری ضربیں لگاتا چلا جا رہا تھا، اس لیے کہ، جیسا وہ خود فرماتے ہیں ؎

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

(بالِ جبریل۔ غزل ۱۶)

اسی لیے اقبال کی نظم "سینما" ہی نہیں بلکہ ساری زندگی کا سارا کلام ان کے اسی فکری نظام کے محور پر گردش کرتا رہا۔

قبل اس کے کہ نظم "سینما" کا قرآن اور احادیث کی روشنی میں تجزیہ کیا جائے یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی ہے کہ ہر زمانہ میں "حال" "ماضی" کے مقابلہ میں زیادہ ترقی یافتہ سمجھا جاتا رہا ہے اور جس طرح "ترقی یافتہ طبقہ" آج اس مضمون کا مذاق اڑانے میں کوئی جھجک محسوس نہ کرے گا اسی طرح جب اقبال نے یہ نظم لکھنے کا ارادہ کیا ہوگا تو انھیں بھی یہ احساس رہا ہوگا کہ لوگ "اس ترقی یافتہ زمانہ" میں اس نظم پر انہیں ماضی کی کوئی آثار قدیمہ ہی

سمجھیں گے۔ پھر بھی چونکہ ان کی رگ رگ میں قرآنی تصورات خون کی طرح دوڑتے تھے اس لیے انہیں خدائے تعالےٰ کا یہ ارشاد بھی یاد رہا ہوگا کہ :۔

"جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، ان کے لیے دنیا کی زندگی بڑی محبوب و دلپسند بنادی گئی ہے۔ ایسے لوگ ایمان کی راہ اختیار کرنے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں، مگر قیامت کے روز پرہیز گار لوگ ہی ان کے مقابلے میں عالی مقام ہوں گے" (سورۃ البقرہ رکوع ۲۶)

۲۔ اقبال نے اس نظم میں سینما کی صنعت کو "صنعت آذری" قرار دیا ہے جس کی وضاحت انھوں نے دوسرے ہی شعر میں خود یہ کی ہے کہ "یہ شیوۂ کافری" کے مترادف ہے۔ کسی چیز کو اپنا عقیدہ اور دین بنانے کے لئے علم کی حقیقت کی کوئی ضرورت محسوس نہ کرنا، حق سے منھ موڑ کر اسے نہ ماننے کا فیصلہ کر لینا، محض قیاس و گمان سے ایک بات فرض کر لینا اور پھر اس پر اسی طرح ایمان رکھنا کہ گویا وہی حقیقت ہے "شیوۂ کافری" ہے یہ رویہ انسان دراصل اپنی خواہشات نفس کی پیروی ہی کے لئے اختیار کرتا ہے جس رویہ کی خاصیت یہ ہے کہ ایسے انسان کا دل یہ چاہتا ہے کہ کوئی ایسا معبود موجود ہو جو دنیا میں اس کا کام تو بناتا رہے اور آخرت اگر واقعی پیش ہی آنے والی ہے تو وہاں انہیں بخشوانے کا ذمہ بھی لے لے۔ مگر حلال و حرام اور خیر و شر کی کوئی پابندی ان پر نہ لگائے اور اخلاق کے کسی ضابطے میں ان کو نہ کسے۔ مسلمان کو جو چیز کافر سے ممیز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ کافر مطلق آزادی کا مدعی ہے اور مسلمان فی الاصل بندہ ہونے کے بعد صرف اس دائرے میں آزادی سے متمتع ہوتا ہے جو اس کے رب نے اسے دی ہے۔

"آذری" سے مراد صرف بتوں کی پرستش کرنی نہیں بلکہ انسان کا شیطان کی بندگی میں لگ جانا ہے۔ یہ بات کہ آذری دراصل شیطان کی بندگی کے مترادف ہے ان آیات سے واضح ہو جاتی ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آذر سے فرمایا :۔

"ابا جان، آپ شیطان کی بندگی نہ کریں، شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہے۔ ابا جان، مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ رحمٰن کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر رہیں" (سورۃ مریم۔ رکوع ۳)

شیطان کی پرستش کبھی بھی کسی زمانے میں نہیں کی گئی ہے اور وہ کبھی بھی لوگوں کا "معبود" نہیں رہا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے لوگ عبادت بتوں کی کیا کرتے تھے لیکن چونکہ وہ شیطان کی اطاعت کر رہے تھے اس لیے آپؑ نے ان کی اس اطاعتِ شیطان کو بھی عبادتِ شیطان ہی قرار دیا اور اسی لیے عبادت محض پرستش کا نام نہیں ہے بلکہ اطاعت کا نام بھی ہے۔ اس رویہ کی مذمت قرآن مجید میں ان الفاظ میں بھی کی گئی ہے کہ :۔

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (حج رکوع ۴)   پس بتوں کی گندگی سے بچو۔

یعنی بتوں کی پرستش سے اس طرح بچو جیسے غلاظت سے آدمی گھن کھاتا ہے اور دور ہٹتا ہے۔ گویا کہ وہ نجاست سے بھرے ہوئے ہیں اور قریب جاتے ہی آدمی ان سے نجس اور پلید ہو جاتا ہے۔

اقبال نے انہی معنوں میں سینما کو "صنعتِ آذری" اور "شیوۂ کافری" قرار دیا ہے۔

۳۔ سینما کی صنعت میں کلیدی نکتہ فلموں میں تصاویر سے تعلق رکھتا ہے جس کے گرد ساری فحاشی، بے شرمی، بے حیائی اور برہنگی گردش کرتی ہے اور جو قرآن اور احادیث کی رو سے "شیوہ کافری" میں داخل ہے۔ تصاویر بنانے کا ذکر قرآن مجید میں سورۂ سبا کی آیت ۱۳ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ کے سلسلہ میں وارد ہوا ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ :۔

"وہ (جن) اس (حضرت سلیمانؑ) کے لیے بناتے تھے جو کچھ وہ چاہتا، اونچی عمارتیں،

تصویریں (تماثیل) بڑے بڑے حوض جیسے لگن اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی بھاری دیگیں۔۔۔اے آلِ داؤد، عمل کرو شکر کے طریقے پر، میرے بندوں میں کم ہی شکر گذار ہیں۔"

لفظ تماثیل، تمثال کی جمع ہے اور عربی زبان میں ہر اس تصویر کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز کی صورت کے مماثل بنائی گئی ہو، خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان۔ مگر حضرت سلیمانؑ کے لیے جو تماثیل بنائی جاتی تھیں وہ ضرور انسانوں اور حیوانوں کی تصاویر یا ان کے مجسمے نہ رہے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پھول پتیاں، قدرتی مناظر اور مختلف قسم کے نقش و نگار ہوں جن سے حضرت سلیمانؑ نے اپنی عمارتوں کو آراستہ کیا۔ یہ بات اس آیت کے آخری فقرہ سے بھی واضح ہو جاتی ہے جس میں صاف طور پر فرمایا گیا ہے کہ "عمل کرو شکر کے طریقے پر"۔ قرآن مجید میں اس طرح کی ہدایت لاتعداد بار وارد ہوئی ہے۔ قرآن کی رو سے شکر کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدا کی عطا کی ہوئی نعمتوں کا حق پہچان کر اس کی رضا کے خلاف استعمال نہ کرے، ان کے استعمال میں خدائی احکام کی تعمیل میں سرکشی، استکبار نہ برتے اور نہ باغیانہ رویہ رکھے اور خدا کا احسان مان کر اس کا مطیع و فرمان بردار بندا رہے۔ قرآن میں اس آیت کا سب سے آخری فقرہ کہ "میرے بندوں میں کم ہی شکر گذار ہیں" بھی بار بار اس لیے وارد ہوا ہے، چونکہ باوجود صاف و صریح ہدایات کے اکثر و بیشتر انسان شیطان کی پیروی میں لگے رہتے ہیں۔ جیسا کہ تصاویر کے معاملہ میں بعد میں آنے والی روایات سے ظاہر ہوگا اور جس سے انحراف "شیوۂ کافری" کے مترادف ہی قرار پائے گا۔ ان باتوں سے ظاہر ہے کہ حضرت سلیمانؑ انسانوں اور حیوانوں کی تصاویر بنوا کر خدا کے ناشکر گذار بندوں میں شامل ہونا کب پسند کریں گے جن کے بنائے ہوئے بیت المقدس کو خدا نے دنیا کے مومنوں کے لیے قبلہ بنایا جانا پسند کیا ہو۔

علاوہ ازیں حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت عیسیٰؑ تک بنی اسرائیل میں جتنے انبیاء بھی آئے وہ سب توراۃ کے پیرو تھے اور ان میں سے کوئی بھی نئی شریعت نہ لایا تھا جو توراۃ کے قانون کی ناسخ ہوتی۔ "تفہیم القرآن" میں سورۃ سبا کے حاشیہ ۲۰ میں توراۃ کی وہ آیات نقل کی گئی ہیں جن میں بار بار بصراحت یہ حکم ملتا ہے کہ انسانی اور حیوانی تصویریں اور مجسمے قطعاً حرام ہیں۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں:۔

"تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا، نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے۔" (خروج۔ باب ۲۰۔ آیت ۴) "تم اپنے لیے بت نہ بنانا اور نہ تراشی ہوئی مورت یا لاٹ اپنے لئے کھڑی کرنا اور نہ اپنے ملک میں کوئی شبیہہ دار پتھر رکھنا کہ اسے سجدہ کرو۔" (احبار۔ باب ۲۶۔ آیت ۱) "لعنت اس آدمی پر جو کاریگری کی صنعت کی طرح کھودی ہوئی یا ڈھالی ہوئی مورت بنا کر جو خداوند کے نزدیک مکروہ ہے اس کو کسی پوشیدہ جگہ میں نصب کرے۔" (استثناء۔ باب ۲۷۔ آیت ۱۵)

سورۃ سبا کی متذکرہ بالا آیت ۱۳ کو دلیل ٹھہرا کر انسانی اور حیوانی تصاویر کو حلال ٹھہرا لینا اس لیے بھی غلط ہے کہ نہایت کثیر التعداد اور قوی الاسناد اور متواتر المعنی احادیث سے یہ ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی روح اشیاء کی تصویریں بنانے اور رکھنے کو قطعی حرام قرار دیا ہے۔ اقبال کے اس قول کو کہ سینما کی صنعت "صنعتِ آذری" اور "شیوۂ کافری" ہے حدیث کی روشنی میں سمجھنے کے لیے چند روایات و آثار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ رہی خدا اور رسولؐ کے احکامات و فرمودات کو ماننے یا نہ ماننے کی بات تو خدا نے تو خود زبردستی منوانے کی ذمہ داری سے رسول اللہؐ کو بری الذمہ قرار دیدیا ہے۔ فرمایا:۔

"اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو۔ لیکن اگر تم اطاعت سے منہ موڑتے ہو تو ہمارے رسولؐ پر صاف صاف حق پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے" (سورۃ التغابن۔ رکوع ۲)

علاوہ ازیں ماننے یا نہ ماننے کی آزادی بھی خود خدا نے انسان کو دے رکھی ہے۔ چونکہ خدا صرف انسان پیدا کرتا ہے کافر یا مومن نہیں۔ یہ انسان کا طرز فکر و طرز عمل ہے جو اسے کافر یا مومن بناتا ہے یا بالفاظ دیگر "ناشکر گذار" یا "شکر گذار" بندہ بناتا ہے۔ ارشاد ہے:۔

"وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا، پھر تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مومن اور اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو" (سورۃ التغابن ۶۴۔ رکوع ۱)

"ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا" (سورۃ الدھر ۷۶۔ رکوع ۱)

۴۔ تصویر کے معاملے میں جو ارشادات حضورؐ سے ثابت ہیں اور جو آثار اکابر صحابہؓ سے منقول ہوئے ہیں ان میں سے چند ذیل میں نقل کیے جا رہے ہیں:۔

اُم المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضرت اُم حبیبہؓ اور حضرت اُم سلمہؓ نے حبش میں ایک کنیسہ دیکھا تھا جس میں تصویریں تھیں۔ اس کا ذکر انھوں نے نبیؐ سے کیا۔ حضورؐ نے فرمایا:۔

"ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ جب ان میں کوئی صالح شخص پیدا ہوتا تو اس کے مرنے کے بعد وہ اس کی قبر پر ایک عبادت گاہ بناتے اور اس میں یہ تصویریں بنا لیا کرتے تھے یہ لوگ قیامت کے روز اللہ کے نزدیک بدترین خلائق قرار پائیں گے"۔ (بخاری)

"کتاب الصلوٰۃ"، مسلمؒ "کتاب المساجد"، نسائیؒ "کتاب المساجد")

"ابو جحیفہ کا بیان ہے کہ رسول اللہؐ نے مصور پر لعنت فرمائی ہے"۔ (بخاری: کتاب البیوع، کتاب الطلاق و کتاب اللباس)

ابن عباسؓ نبیؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:۔

"جس شخص نے تصویر بنائی اسے عذاب دیا جائے گا اور مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس میں روح پھونکے اور وہ نہ پھونک سکے گا"۔ (بخاریؒ "کتاب التعبیر"، ترمذیؒ "ابواب اللباس"، نسائیؒ "کتاب الزینۃ"، مسند احمد)

حضرت ابو طلحہؓ، جو کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جنگ بدر میں شریک ہوئے تھے بیان کرتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:۔

"جس مکان میں کتا یا تصویر ہوتی ہے اس میں فرشتے نہیں آتے ہیں"۔ (تجرید "صحیح بخاری شریف" اردو۔ نمبر شمار ۱۵۵۲)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

"قیامت کے روز اللہ کے ہاں سخت ترین سزا پانے والے مصور ہوں گے" (بخاریؒ "کتاب اللباس"، مسلمؒ "کتاب اللباس"، نسائیؒ "کتاب الزینۃ"، مسند احمد)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے ایک تکیہ خریدا جس میں تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ پھر نبیؐ تشریف لائے اور دروازے ہی پر کھڑے ہو گئے۔ اندر داخل نہ ہوئے میں نے عرض کیا کہ میں خدا سے توبہ کرتی ہوں ہر اس گناہ پر جو میں نے کیا ہو۔ حضورؐ نے فرمایا: "یہ تکیہ کیسا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ یہ اس غرض کے لیے ہے کہ آپؐ یہاں تشریف رکھیں اور اس پر ٹیک لگائیں۔ فرمایا:۔

"ان تصویروں کے بنانے والوں کو قیامت کے روز عذاب دیا جائے گا۔ ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے بنایا ہے اس کو زندہ کرو۔ اور ملائکہ (یعنی ملائکہ رحمت) کسی ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویریں ہوں" (بخاری: "کتاب اللباس"، مسلم: "کتاب اللباس"، نسائی: "کتاب الزینۃ"، ابن ماجہ: "کتاب التجارات"، مؤطا: "کتاب الاستیذان")

سعید بن ابی الحسن کہتے ہیں کہ میں ابن عباسؓ کے پاس بیٹھا تھا استنے میں ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ اے ابو عباس میں اپنے ہاتھ سے روزی کماتا ہوں اور میرا روزگار یہ تصویریں بنانا ہے۔ ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ میں تم سے وہی بات کہوں گا جو میں نے رسول اللہ صلعم کو فرماتے سنی ہے کہ جو شخص تصویر بنائے گا اللہ اسے عذاب دے گا اور اسے نہ چھوڑے گا، جب تک اس میں روح نہ پھونکے اور وہ کبھی روح نہ پھونک سکے گا۔ یہ بات سن کر وہ شخص سخت برافروختہ ہوا اور اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس پر ابن عباسؓ نے کہا:۔

"بندۂ خدا، اگر تجھے تصویر بنانی ہی ہے تو اس درخت کی بنا، یا کسی ایسی چیز کی بنا جس میں روح نہ ہو"۔ (بخاری: "کتاب البیوع"، مسلم: "کتاب اللباس"، نسائی: "کتاب الزینۃ"، مسند احمد)

ان روایات کے مقابلہ میں کچھ روایتیں ضرور ایسی بھی پیش کی جاتی ہیں جن میں تصاویر کے معاملہ میں رخصت پائی جاتی ہے۔ مگر جہاں تک تصویر بنانے کا تعلق ہے اس کا جواز ان سے کبھی بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام میں یہ اصول مسلّم ہے کہ معتبر اسلامی ضابطہ وہی ہے جو تمام تدریجی احکام اور ابتدائی رخصتوں کے بعد حضورؐ نے اپنے آخر عہد میں مقرر کر دیا ہو۔ اور آپؐ کا اور اکابر صحابہؓ کا کسی طریقے پر عملدرآمد کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اسی طریقے پر حضورؐ نے امت کو چھوڑا تھا۔ چند ایسی روایات بھی پیش ہیں کہ حضرت عمرؓ نے عیسائیوں

سے کہا کہ:۔

"ہم تمہارے کنیسوں میں اس لیے داخل نہیں ہوتے کہ ان میں تصویریں ہیں" (بخاری: "کتاب الصلوٰۃ")

ابو الہیاج اسدی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے مجھ سے کہا:۔

"کیا نہ بھیجوں میں تم کو اس مہم پر جس پر رسول اللہؐ نے مجھے بھیجا تھا؟ اور وہ یہ ہے کہ تم کوئی مجسمہ نہ چھوڑو جسے توڑ نہ دو، اور کوئی اونچی قبر نہ چھوڑو جسے زمین کے برابر نہ کر دو اور کوئی تصویر نہ چھوڑو جسے مٹا نہ دو"۔ (مسلم: "کتاب الجنائز"، نسائی: "کتاب الجنائز")

اس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں تصاویر کی حرمت متنازعہ فیہ یا مشکوک مسئلہ نہیں ہے بلکہ نبیؐ کے صریح ارشادات، صحابہ کرامؓ کے عمل اور فقہائے اسلام کے متفقہ فتاویٰ کی رو سے ایک مسلم قانون جسے تہذیب حاضر کے گرفتار" لوگوں کی موشگافیاں بدل نہیں سکتیں۔ احادیث میں کہیں یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ تصاویر صرف شرک و بت پرستی سے بچانے کے لیے حرام کی گئی ہے۔ تصاویر صرف شرک و بت پرستی کی موجب نہیں بنتیں بلکہ بہت سے دوسرے فتنوں کی موجب بھی بنتی ہیں جیسے شہوانیت، فساد انگیزی، جرائم وغیرہ۔ اسلامی شریعت حلال و حرام کے درمیان ایسی دھندلی اور مبہم حد بندیاں قائم نہیں کرتی جن سے آدمی یہ فیصلہ نہ کر سکتا ہو کہ وہ کہاں تک جواز کی حد میں ہے اور کہاں اس حد کو پار کر گیا ہے۔ بلکہ ایسا واضح خطِ امتیاز کھینچتی ہے جسے ہر شخص روز روشن کی طرح دیکھ سکتا ہے۔

اس مضمون میں تصاویر کے متعلق یہ بحث صرف اقبال کی نظم "سینما" میں سینما کی

صنعت کو سرے سے "صنعت آذری" اور "شیوۂ کافری" قرار دیے جانے کے سلسلہ میں لائی گئی ہے۔

اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ تصاویر کے متعلق روایات میں رخصت بھی پائی جاتی ہے مگر نعوذ باللہ وہ کون سی روایات ہیں جن سے جواز فراہم کر کے ایسے اداروں میں جن کے نام میں مسلم، اسلام اور اسلامیہ لگایا ہوا اس کے بانیوں کے دس فٹے مجسمے منظر عام پر نصب کیے جاتے ہیں، یا فلموں میں نیم برہنگی کی حالت میں بے حیائی، بے شرمی اور ڈھٹائی سے بوس و کنار، ہم بستری، مردوں اور عورتوں کا بے حجابانہ اختلاط اور اپنے جسم کے ان حصوں کی جن کا اظہار شرع میں ممنوع ہے نمائش جائز اور حلال قرار دی گئی ہے۔ اگر یہ "شیوۂ کافری" نہیں تو پھر قرآن مجید کے تیس۳۰ پاروں میں صرف کفر اور ایمان کے امتیازی فرق پر بحث، دلائل اور ان کے نتائج کا ذکر کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اقبال نے نظم "سینما" میں کفر و ایمان کے اسی فرق کو جس پس منظر میں ذہن نشین کرایا ہے اسی میں ان کی یہ نظمیں بھی پڑھی جا سکتی ہیں:-

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار!

موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار!

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار!

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار! (ضرب کلیم: "ہنروران ہند")

کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگِ تخیل
ہندی بھی فرنگی کا مقلد، عجمی بھی!

مجھ کو تو یہی غم ہے کہ اس دور کے بہزاد
کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرورِ ازلی بھی!

معلوم ہیں اے مردِ ہنر تیرے کمالات
صنعت تجھے آتی ہے پرانی بھی نئی بھی!

فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے
آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی! (ضرب کلیم: "مصور")

۵۔ کفر و ایمان کے معاملہ میں "آزادئ افکار" کے تحت اپنی طرف سے علتِ حکم خود تجویز کر کے اس کے لحاظ سے بعض تصویر کو حرام اور بعض کو حلال کرنے کا ایک بہت سنگین، عبرتناک اور سوہانِ روح واقعہ کتاب "تذکرہ" کے مقدمہ سے ذیل میں تفصیل سے درج کیا جا رہا ہے۔

اس کتاب میں مولانا ابوالکلام آزاد کے خاندان کے اکابر و شیوخ کی سوانح و حالات، اور خود مولانا کی خود نوشت ہے جسے جناب فضل الدین احمد مرزا بی۔ ایس۔ سی، ایم۔ الف۔ جی ایس (یو کے)، کلکتہ نے مرتب کر کے خود اس کا مقدمہ لکھا اور انار کلی کتاب گھر، لاہور سے ۱۹۱۹ء میں شایع کیا۔ اس مقدمہ کے اقتباسات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تصویر کے معاملہ میں "تازہ شریعت" نے کہاں تک کفر و ایمان کے فرق ہی کو مٹا دیا ہے اور اقبال کے الفاظ میں، اس ضمن میں "شیوۂ کافری" کس حد کو پہنچ چکی ہے۔ جناب فضل الدین احمد اپنے مقدمہ کے آخر میں لکھتے ہیں:-

"آخر میں مجھے ایک خاص معاملہ کی نسبت چند الفاظ کہنے ہیں۔ اس کتاب کا ایک ضروری جزو یہ بھی تھا کہ مصنف کی تصویر سے مزین ہوتی۔ موجودہ زمانے میں کسی شخص کی سوانح عمری کا بغیر فوٹو کے شایع کرنا ایک ایسی بے قاعدگی ہے جس کو کوئی خوش مذاق آدمی گوارا نہیں کر سکتا۔ علاوہ بریں مولانا کے ہزاروں ارادت مند ہیں، جن کو بڑی مایوسی ہوتی اگر کتاب ان کے فوٹو سے خالی ہوتی۔ اس لیے میں نے کوشش کی کہ مولانا کا سب سے آخری فوٹو حاصل کر کے درجِ تذکرہ کروں۔ مجھے معلوم تھا کہ اپنی تصویر کی اشاعت کی انھوں نے ہمیشہ مخالفت کی ہے۔ "الہلال" میں دنیا جہاں کی تصویریں نکلتی ہیں مگر لوگوں کے سخت اصرار پر بھی انھوں نے کبھی اپنا فوٹو شایع نہیں کیا۔ انجمنِ اعانت نظربندان دہلی نے بار بار ان سے فوٹو طلب کیا مگر انھوں نے نہ بھیجا۔ سید فضل الرحمٰن نے اخبار "جمہور" کلکتہ میں ان کے فوٹو کا

اعلان شایع کیا تھا۔ اس پر وہ سخت برہم ہوئے اور بڑا ہی سخت خط ان کو لکھا۔ پھر مجھے
لکھا کہ جس قدر کاپیاں انھوں نے تیار کی ہیں، میری طرف سے خرید کر کے رکھ لو اور شایع
نہ ہونے دو۔ پھر جب قاضی عبدالغفار صاحب ایڈیٹر "جمہور" ان سے ملنے رانچی گئے تو ان سے
بھی وعدہ لیا کہ اخبار میں ایک نوٹ اس مضمون کا درج کر دیں گے کہ یہ کارروائی
بلا ان کے علم کے ہوئی ہے، مگر انھوں نے درج نہیں کیا۔ میں ان تمام موقعوں پر یہی سمجھتا
رہا کہ یہ مخالفت یا تو انکسارِ طبع کی بنا پر ہے یا ان کی طبیعت کے اس عام خاصہ کا نتیجہ ہے
کہ جو بات عام طور پر لوگ کر رہے ہوں اس سے خود پرہیز کرتے ہیں۔ لیکن اس کا تو کبھی
خیال بھی نہیں ہوا تھا کہ مولانا تصویر کھنچوانے اور رکھنے کو شرعاً ناجائز سمجھتے ہوں گے
خود "الہلال" انھوں نے باتصویر نکالا اور ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی تصویر بھی کھنچوائی۔
لیکن جب میں نے تصویر کی نسبت کہا تو انھوں نے لکھا کہ:۔

"تصویر کا کھنچوانا، رکھنا، شایع کرنا سب ناجائز ہے۔ یہ میری سخت غلطی تھی کہ
تصویر کھنچوائی تھی اور "الہلال" کو باتصویر نکالا تھا۔ میں اب اس غلطی سے تائب ہو چکا
ہوں۔ میری پچھلی لغزشوں کو چھپانا چاہیے نہ کہ از سرِ نو ان کی تشہیر کرنی چاہیے"۔

اس کے بعد جناب فضل الدین احمد صاحب نے اس مقدمہ میں کیا تحریر فرمایا ہے
اسے بھی سنیے اور "تازہ شریعت" جو "آزادی افکار" نے مرتب کی ہے اس پر سر دھنیے اس لیے
کہ یہ "شریعت" مولانا ابوالکلام آزاد پر نافذ کی جا رہی ہے:۔

"لیکن اس جواب سے میری تشفی تو نہ ہوئی۔ میں علم شریعت کا ماہر نہیں۔ اور
علی الخصوص مولانا کے فتوے کے سامنے تو مجھے دم مارنے کا وہم بھی نہیں گذر سکتا۔
لیکن بات میری سمجھ میں کسی طرح نہیں آتی کہ آج تک مولانا کو شریعت کے اس حکم کی

خبر نہ تھی اور جس کام کو علانیہ کرتے رہے ہیں وہ اب یکا یک ناجائز نکل آیا ہے۔ خود
"الہلال" میں مولانا نے شیخ الاسلام قسطنطنیہ، شیخ محمد عبدہٗ مصری، مولانا شبلی نعمانیؒ اور
کتنے ہی علماء و مشائخ کی تصویریں شایع کی ہیں۔ تعجب ہے کہ شریعت کا حکم ایسے مشاہیر
علماء کو معلوم نہ تھا۔ بہرحال مولانا کے اس حکم کی میں تعمیل نہ کر سکا اور کتاب کے ساتھ
ان کا سب سے آخری فوٹو شایع کر رہا ہوں۔ یہ فوٹو رانچی میں لیا گیا ہے اور مولانا
کی بریت کے لیے اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کم سے کم اس کے کھنچوانے میں خود مولانا کے
ارادہ کو کچھ دخل نہ تھا۔ وہ بالکل مجبور تھے"۔

ان اقتباسات پر قرآن مجید کی درج ذیل آیات کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا تاکہ
قارئین خود فیصلہ کریں کہ ان آیات کے کن فقروں کا اطلاق مولانا ابوالکلام آزاد پر
ہوتا ہے اور کن فقروں کا جناب فضل الدین احمد پر:۔

"اگر تم میں سے کوئی نادانی کے ساتھ کسی برائی کا ارتکاب کر بیٹھا ہو پھر اس کے
بعد توبہ کرے اور اصلاح کرے تو وہ (خدا) اسے معاف کر دیتا ہے اور نرمی سے
کام لیتا ہے"۔ (سورۃ الانعام ۶۔ رکوع ۶)

"جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں در آں
حالیکہ ہم ان ہی سب انسانوں کی رہنمائی کے لیے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں،
یقین جانو کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر
لعنت بھیجتے ہیں۔ البتہ جو اس روش سے باز آ جائیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح
کر لیں اور جو کچھ چھپاتے ہیں، اسے بیان کرنے لگیں، ان کو میں معاف کر دوں گا
اور میں بڑا درگذر کرنے والا رحم کرنے والا ہوں"۔ (سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۱۹)

اب اس آزادئ فکر پر اقبال کی دو نظمیں بھی پڑھتے چلیں جن کا اطلاق صرف اس واقعہ پر ہی نہیں ہوتا بلکہ اقبال کی نظم "سنیما" میں اسی آزادئ فکر پر دریردہ کاری ضرب لگائی گئی ہے :-

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے ۔۔۔ حریتِ افکار کی نعمت ہے خداداد
چاہے تو کرے کعبے کو آتشکدۂ پارس ۔۔۔ چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد!
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر ۔۔۔ چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد!

ہے مملکتِ ہند میں اک طرفہ تماشا
اسلام ہے محبوس، مسلمان ہے آزاد! (ضرب کلیم: "آزادی")

آزادئ افکار سے ہے ان کی تباہی ۔۔۔ رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادئ افکار ۔۔۔ انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ!

(ضرب کلیم: "آزادئ فکر")

(باقی)

کیا محمد بن القاسم ظالم تھا یا انصاف پسند فاتح؟

از ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں نئی دہلی

"یہ مفید مضمون ٹائمز آف انڈیا میں چھپا تھا اور اسی وقت خیال ہوا تھا کہ اس کا ترجمہ معارف میں شایع کیا جائے لیکن فاضل مضمون نگار نے خود ہی اس کا ترجمہ معارف میں شایع کرنے کے لیے ہمارے پاس بھیجا ہے جس کو ہم شکریہ کے ساتھ ذیل میں شایع کر رہے ہیں (م)

جون کے آخر میں دمشق کے دورے کے دوران وزیر اعظم راجیو گاندھی نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ محمد بن القاسم ہندوستان میں اسلام کا پیام لے کر آئے تھے۔ کچھ فرقہ پسند ہندوؤں نے اس بیان پر فوراً ہی اپنے شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ اس مختصر تحریر میں ان مسائل اور دعوؤں کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے جو ہندو مہاسبھا کے کارگذار صدر جینت پٹیل نے ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲۰ جون ۱۹۸۸ء کے نام ایک خط میں کیے ہیں۔

مسٹر پٹیل کے دعوؤں کو مختصر طور پر مندرجہ ذیل پانچ نقطوں میں پیش کیا جا سکتا ہے کہ محمد بن القاسم نے :

۱- سندھ کے راجہ داہر کو "فتح" کے بعد قتل کیا۔

۲- سندھ کی ہندو آبادی کا قتل عام کیا۔

۳- بہت سے لوگوں کو غلام بنایا۔

۴- فتح شدہ شہر "راوڑ" کو نیست و نابود کر دیا۔

۵- راجہ داہر کی ۲ دو نوجوان لڑکیوں کو گرفتار کر کے خلیفہ کی "عیاشی" کے لیے ایک تحفہ کے طور پر دمشق روانہ کیا۔

ان الزامات کے سلسلہ میں مسٹر پٹیل نے ۲ دو کتابوں کے حوالے دیے ہیں۔ ایک علی الکوفی (وفات ۶۱۳ھ/۱۲۱۶ام) کا چچ نامہ اور دوسری کتاب البلاذری (وفات ۲۷۹ھ/۸۹۲م) کی فتوح البلدان۔ چچ نامہ محمد بن القاسم کی فتح سندھ کے بہت بعد فارسی زبان میں لکھا گیا ہے۔ یہ چچ کے زمانے سے لیکر محمد بن القاسم تک کی سندھ کی عام تاریخ ہے، جبکہ دوسری کتاب فتوح البلدان عرب فتوحات کی تاریخ ہے۔ فتوح البلدان تاریخ کی ایک مستند کتاب ہے اور اس کا مصنف ایک معروف مؤرخ ہے۔ جبکہ چچ نامہ کا مصنف غیر معروف ہے۔ یہ ایک عرب خاندان کی تاریخ اور اس کی بہادری کی داستان ہے، جو سندھ میں "بالکر" کے مقام پر عرب فاتحین کے کچھ مجہول وارثوں کے پاس محفوظ تھی۔ اس کتاب کا علی الکوفی نے عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ دیارام گیدومل چچ نامہ کے انگریزی ترجمہ کے مقدمہ میں کہتے ہیں کہ "چچ نامہ میں سنی سنائی باتوں اور افواہوں کو اکٹھا کر دیا گیا ہے"۔ (مقدمہ، ص ۱۱)

ان دونوں کتابوں فتوح البلدان (مطبوعہ قاہرہ سنہ ۱۹۰۱ء) اور چچ نامہ (طبع جدید دہلی، سنہ ۱۹۷۹ء، مترجمہ میرزا قلیچ بیگ فریدون بیگ) کا مطالعہ مسٹر پٹیل کے کسی بھی دعوے کی تصدیق یا تائید نہیں کرتا ہے۔ یہاں میں ان ہی ۲ دو کتابوں کی روشنی میں جن کا

حوالہ مسٹر پٹیل نے دیا ہے، ان کے دعوؤں اور محمد بن القاسم پر ان کے الزامات کا ایک ایک کر کے جائزہ لوں گا:

۱- مذکورہ دونوں کتابوں کے مطابق راجہ داہر کو لڑائی کے بعد قتل نہیں کیا گیا۔ دونوں کتابیں اس بات کی تائید کرتی ہیں کہ راجہ داہر ایک شدید جنگ میں لڑتے ہوئے مارا گیا۔ (فتوح البلدان ص ۴۴۳، چچ نامہ ص ۱۴۳-۱۴۴)

۲،۳- دونوں کتابیں آبادی کے قتل عام یا آبادی کو غلام بنانے کے بارے میں مکمل طور سے خاموش ہیں۔ لڑنے والے جنگوں کے دوران اور جنگوں کے بعد، اگر انھوں نے نئے فاتحین کی مخالفت میں تلوار اٹھائی تو ہلاک کر دیے گئے۔ لیکن اس کے باوجود اس قسم کے لڑنے والوں کو بھی معاف کر دینے کی مثالیں ملتی ہیں (مثلاً دیکھئے چچ نامہ صفحات ۱۰۵، ۱۱۶، ۱۸۰) حقیقت یہ ہے کہ محمد بن القاسم نے لوگوں کو معاف کرنے کے سلسلہ میں اس قدر رواداری کا ثبوت دیا کہ عراق کے گورنر حجاج کو سرکاری طور پر اسے سرزنش کرنی پڑی (چچ نامہ ص ۱۵۵) عرب افواج نے سندھ پر حملہ عراق کے گورنر حجاج ہی کے حکم پر کیا تھا۔

۴- دونوں کتابیں شہر "راوڑ" کو نیست و نابود کرنے کی تائید نہیں کرتیں۔ اس کے بجائے فتوح البلدان (ص ۴۴۳) میں کہا گیا ہے کہ محمد بن القاسم نے شہر راوڑ کو ہفتوں کے محاصرہ کے بعد اس شرط پر کہ "نہ کسی شخص کو قتل کیا جائے گا اور نہ ان کے بڑے "بد" (بڑے بت یا مندر) کو کوئی نقصان پہنچایا جائے گا"، پرامن طریقے سے فتح کیا۔ چچ نامہ میں راوڑ شہر کی تباہی کا ذکر موجود نہیں ہے۔ اس کے بجائے یہ ہے کہ شہر راوڑ پر قبضہ کے بعد محمد بن القاسم نے اس کی شہری زندگی کے معمولات کو باقی رکھا" (چچ نامہ ص ۱۵۵)

۵۔ اس میں شک نہیں کہ جنگی قیدیوں میں کچھ عورتیں بھی ضرور رہی ہوں گی جن کو غلام بنا لیا گیا، لیکن یہ اقدام اسلامی جنگی قوانین کے عین مطابق ہے اور ان میں صرف وہی عورتیں اور نابالغ بچے ہو سکتے ہیں جن کے مردوں نے اسلامی فوج کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے۔ چچ نامہ میں کچھ ایسی عورتوں کا بھی ذکر ملتا ہے جن کا تعلق "شاہی" خاندان سے تھا اور غلام بنائی گئی تھیں (ص ۱۵۴) لیکن اسی کے ساتھ اسی کتاب میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب راجہ داہر کو شکست ہو گئی اور محمد بن القاسم قلعہ کی طرف روانہ ہوا تو "راوڑ" (شہر کے) قلعہ میں موجود ساری عورتوں نے "خودکشی کر لی" (ص ۱۵۳-۱۵۴) دیارام گیدومل کے قول کے مطابق جس کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں کیا ہے "راجہ داہر کی لڑکیوں کی داستان apocryphal یعنی فرضی اور بعد میں گڑھی گئی ہے" (مقدمہ ص ۹)

فتوح البلدان کے بیان کے مطابق جنگ کے دوران چار ہزار "زط" (یعنی جاٹ) بھی محمد بن القاسم کے ساتھ تھے (ص ۴۴۳، چچ نامہ صفحات ۱۱۶-۱۱۷) اس کے علاوہ چچ نامہ میں ایسی بہت سی مثالوں کا ذکر ملتا ہے جس میں ہندوؤں نے محمد بن القاسم کا ساتھ دیا اور اس کی طرف سے جنگ میں شرکت کی۔ مثال کے طور پر نیرون کے حکمران بھنڈرکن سامانی (ص ۹۲-۹۳) جورٹہ کا بادشاہ موکہ (صفحات ۱۰۶-۱۰۸) بٹ کا بادشاہ جاسین (ص ۱۰۵- اور اس کا بھائی راسل نے جس کو راجہ داہر نے اس کے بھائی جاسین کی بغاوت کے بعد بٹ کا بادشاہ مقرر کیا تھا (صفحات ۱۳۰-۱۳۲) برہمن آباد کے محاصرے کے دوران جو کہ عرب افواج کے کمانڈروں میں شامل تھا (صفحات ۱۵۹-۱۶۰) دوسری طرف عربوں کی ایک فوج راجہ داہر کی طرف سے میدان جنگ میں موجود تھی جس کا کمانڈر ایک باغی عرب محمد علافی تھا۔ ان عربوں نے راجہ داہر کی موت کے بعد بھی اس کے

لڑکوں جیسیاہ اور خوفی کی امداد جاری رکھی اور ان کی طرف سے لڑتے رہے (صفحات ۹۹-۱۱۰-۱۱۱، ۱۲۷-۱۲۸، ۱۳۵-۱۳۶، ۱۳۷، ۱۵۲، ۱۴۸) محمد بن القاسم نے ان علاقوں کی حکمرانی ان کے ہندو حکمرانوں کے ہی ہاتھوں میں چھوڑ دی جنھوں نے اس کے ساتھ صلح کر لی تھی (چچ نامہ صفحات ۸۲-۸۵ (دیبل) ۱۰۴-۱۰۶ (نیرون) ۱۶۶-۱۶۸ (جورٹہ) ۱۶۵ (برہمن آباد) ۱۵۸ (دھلیلہ) ۱۸۷-۱۸۹ (بابیہ) اس کے علاوہ محمد بن القاسم نے راجہ داہر کے وزیر سیاکر کو اپنا وزیر بھی مقرر کر لیا تھا (ص ۱۵۸)

محمد بن القاسم نے مفتوح لوگوں کے ساتھ انتہائی فراخدلی کا برتاؤ کیا۔ جن لوگوں نے بغیر لڑے ہوئے ہتھیار ڈال دیے یا تھوڑے بہت مقابلہ کے بعد متفقہ شرائط پر اطاعت قبول کر لی ان کو قطعاً ہاتھ نہیں لگایا گیا۔ جہاں کہیں بھی مقابلہ کیا گیا وہاں صرف لڑنے والوں کو ہلاک کیا گیا اور ان کی بیویوں اور نابالغ بچوں کو اسلامی جنگی قوانین کے تحت محض غلام بنا لیا گیا۔ چچ نامہ فراخدلی اور معافی کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ (مثلاً ص ۹۵، ۹۷، ۹۸، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۲۵، ۱۶۴، ۱۶۷، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۷، ۱۸۸) برہمنوں کو سماج میں نہ صرف ان کے گذشتہ باعزت مقامات پر بحال کر دیا گیا بلکہ ان کو اپنے لیے عوام سے خصوصی ٹیکس لینے کی اجازت بھی دے دی گئی۔ مذکورہ ٹیکس حکومت کی طرف سے جمع شدہ کل مالیات کا تین فیصد ہوتا تھا (چچ نامہ صفحات ۱۶۵-۱۶۹)

سندھ میں عربوں کی فتوحات کے سلسلہ میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ محمد بن قاسم نے ہندوؤں کو "اہل کتاب" کا درجہ دے کر اسلامی نظام میں ایک نئی نظیر قائم کر دی، یعنی وہ عیسائیوں، یہودیوں اور صابئین کے برابر ہو گئے۔ ہندوؤں کو یہ درجہ دینے کا

فیصلہ عراق میں گورنر حجاج اور دمشق میں خلیفہ نے بڑے غور و خوض اور مشوروں
کے بعد کیا۔ اس فیصلہ کے بعد الحجاج نے محمد بن القاسم کو لکھا کہ جب لوگوں نے
ایک بار اطاعت قبول کرلی تو

"ہمیں عام ٹیکس لینے کے علاوہ ان پر اور کیا حق حاصل ہے۔ کیونکہ جب وہ ذمیوں
کے شمار میں آگئے تو ہمیں ان کی زندگیوں یا جائیداد میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے
اس لیے ان کو ان کی پرستش کے لیے جن کی وہ عبادت کرتے ہیں مندر بنانے کی ضرور
اجازت دو۔ کسی بھی شخص کا اپنے مذہب پر چلنا ممنوع یا قابل سزا نہیں ہے اور کسی بھی
شخص کو انھیں ان کے مذہب پر چلنے سے روکنے مت دو تاکہ وہ اپنے گھروں میں
ہنسی خوشی سے زندگی بسر کرسکیں۔" (چچ نامہ صفحات ۱۶۸-۱۶۹)

یہ ایک اہم اجتہاد تھا کیونکہ ابھی تک بت پرستوں کو اگر وہ اسلام قبول نہیں کرتے
تھے تو ہلاک کردیا جاتا تھا۔

محمد بن القاسم کا مفتوح لوگوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک تھا، ان سے
انصاف کے ساتھ پیش آتا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ ایک بستی میں آئے تو سندھیوں
نے ان کا ناچتے اور گاتے ہوئے استقبال کیا (چچ نامہ ص ۱۷۴) اور لوگوں نے بغیر
مقابلہ کیے ہوئے انکی اطاعت قبول کرلی (صفحات ۱۷۷-۱۷۸)

دمشق کی محلاتی سازشوں کی وجہ سے محمد بن قاسم کو جلد ہی سندھ سے واپس بلالیا
گیا اور قید کردیا گیا۔ اس واقعہ پر مقامی لوگوں نے کس ردعمل کا اظہار کیا اس کے بارے
میں فتوح البلدان (ص ۴۴۶) میں کہا گیا ہے کہ "ہندوستان کے لوگ روئے اور کیراج
(یا کورج) کے مقام پر انھوں نے اس کا ایک بت بنالیا۔"

یہ مختصر مضمون اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک ان اہم واقعات کا ذکر
نہ کیا جائے جن کے تحت عراق کے گورنر حجاج نے محمد بن القاسم کی سرکردگی میں
سندھ پر دوسری فوجی مہم روانہ کی (اس سے پہلے تین ہزار فوجیوں پر مشتمل ایک چھوٹی
مہم بازل کی سرکردگی میں روانہ کی تھی جس کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا) چچ نامہ سے
ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کے بعض دوسرے حکمرانوں کی طرح راجہ داہر بھی خلیفہ کو
خراج ادا کرتا تھا (صفحات ۸۹، ۱۱۷-۱۱۸) لیکن بعد میں راجہ داہر نے کئی سال تک
نہ صرف خراج ہی بند کیا بلکہ ہندوستان کے کچھ مسلمانوں کو قید کرلیا (ص ۷۳)
اس کے علاوہ سرندیپ (سری لنکا) سے چلنے والی ان کشتیوں کو بھی پکڑ کر قبضہ
کرلیا جن پر قیمتی اشیاء لدی ہوئی تھیں (ص ۸۹، مزید تفصیلات بہ صفحات ۵۷،
۶۹، ۷۰) جب حجاج نے اس سمندری ڈاکہ زنی کے بارے میں راجہ داہر سے
شکایت کی تو اس نے ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کردیا (ص ۷۱) ان مسلمان
قیدیوں میں سے کچھ لوگوں کو بعد میں دیبل کے قلعہ (ص ۴۳) اور کچھ کو برہمن آباد
کے قلعہ سے آزاد کرایا گیا (ص ۱۵۷) یہ دونوں قلعے داہر کے قبضے میں تھے۔ اس
بات کی شہادت موجود ہے کہ علاقہ کے کچھ دوسرے حکمراں مثلاً نیرون کا حکمراں
خلیفہ کو خراج ادا کیا کرتے تھے (ص ۷۲، ۹۱-۱۰۳)

داہر نے باغی علافی عربوں کو پناہ دے کر بھی حجاج کو ناراض کردیا تھا۔
ان عربوں کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے ان ایرانیوں
کو بھی پناہ دے رکھی تھی جو ایران میں عرب حکومت کے خلاف سازشوں میں مصروف
تھے۔ مزید برآں داہر عرب بحری تجارت کے لیے خطرہ بن گیا تھا (دیکھیے

مبارک علی، تاریخ سندھ، عرب دور حکومت، حیدرآباد، سندھ ریسرچ سوسائٹی، سنہ ۱۹۸۳ء ص ۱۲۸ اور بعد کے صفحات) شاید اسی وجہ سے فتوح البلدان میں بیان کیا گیا ہے کہ جب الحجاج کو بالآخر فتح سندھ کی خوشخبری ملی تو اس نے کہا "ہمارا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور ہم نے اپنا انتقام لے لیا ہے" (ص ۴۲۵)

اگرچار ہزار ہندو (جاٹ) محمد بن القاسم کی مہم میں اس کے ساتھ تھے اور سندھ سے اس کے جانے کے بعد ہندو آبادی نے رو رو کر اور اس کی یاد میں اس کا بت بنا کر اس کا ماتم کیا تھا تو پھر یقیناً محمد بن القاسم ہرگز وہ نہیں تھا جو تیرہ سو سال کے بعد کچھ لوگ اس کو بنا کر پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

تاریخ سندھ

(مؤلفہ مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی سابق رفیق دارالمصنفین)

اس کتاب میں سندھ کا جغرافیہ، مسلمانوں کے حملہ سے پیشتر کے مختصر حالات اور خلفاے راشدین کے مبارک زمانہ سے لے کر آٹھویں صدی ہجری تک صوبہ سندھ میں جو جو حکومتیں قائم ہوئیں ان سب کی پوری تاریخ کے علاوہ ان تمام حکومتوں کے نظام، ان کے علمی و تمدنی حالات اور انھوں نے رفاہ عام کے جو کام کیے ان سب کی پوری تفصیل پیش کی گئی ہے۔

ضخامت:۔ ۳۹۰ صفحات

قیمت:۔ ۲۹ روپیے

تلخیص و تبصرہ

امریکہ میں مسلمان

"پروفیسر ایوانے یازبیک حداد ایک شامی النسل خاتون ہیں، ان کی مادری زبان عربی ہے اور وہ امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں اسلامک ہسٹری کی پروفیسر ہیں، ان کی دلچسپی اور تحقیق کے خاص موضوعات یہ ہیں (۱) بیسویں صدی میں اسلام کی علمی، سماجی اور سیاسی تاریخ (ممالک عرب میں) (۲) قرآنیات (۳) شمالی امریکہ میں مسلمان۔

نومبر سنہ ۸۸ء میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز (ہمدرد نگر، نئی دہلی) کے زیر اہتمام پروفیسر صاحبہ نے "امریکہ میں مسلمان" کے موضوع پر ایک دلچسپ اور پر از معلومات تقریر کی، جناب سید شہاب الدین دسنوی صاحب معتمد دارالمصنفین بھی حسن اتفاق سے اس جلسہ میں موجود تھے اور انھوں نے ان کی تقریر کا خلاصہ قلمبند کر کے راقم کے پاس بھیجا جس کو ناظرین معارف کی دلچسپی کیلئے شایع کیا جاتا ہے" (ض)

اس وقت امریکہ میں چالیس لاکھ مسلمان آباد ہیں اور توقع ہے کہ سنہ ۲۰۰۰ء تک یہ تعداد بڑھ کر ساٹھ لاکھ ہو جائے گی، ان کی نوعیت اس طرح ہے۔

(الف) سیاہ رنگ کے مسلمان جو امریکہ کے اصل باشندے ہیں ان کو بلالی مسلمان

کہا جاتا ہے۔ یہ دس لاکھ کے قریب ہوں گے۔

(ب) وہ ہندوستانی، پاکستانی اور عرب مسلمان جنھوں نے وہاں مستقل سکونت اختیار کرلی ہے۔

(ج) وہ امریکی جنھوں نے اسلام قبول کرلیا ہے۔

(س) ہندوستان، پاکستان اور دوسرے ملکوں سے حصول معاش کے لیے جانے والے وہ مسلمان جن کا امریکہ میں مستقل سکونت کا ارادہ نہیں ہے۔

امریکہ میں چھ سو مسجدیں ہیں جن میں ۳۵۰ کا تعلق جماعت اسلامی سے ہے اور ۲۷ کا تعلق تبلیغی جماعت کے کارکنوں سے ہے، امریکہ میں گیارہ ہزار کے قریب مسلمان تبلیغی جماعت سے وابستہ ہیں۔

مسلمانوں نے اپنے بچوں کی تعلیم کیلئے دو سو سنڈے اسکول کھول رکھے ہیں جن میں ہفتہ میں دو گھنٹے اور کہیں چار سے پانچ گھنٹے اسلامیات کی تعلیم ہوتی ہے، ساٹھ دینی مدارس بھی ہیں۔

پروفیسر ایوانے یازبیک حداد نے بلالی مسلمانوں کے بارے میں یہ دلچسپ بات بھی بتائی کہ ان میں سے کئی ایک جرائم پیشہ ہونے کی وجہ سے جیل گئے اور وہاں انھیں اسلام کے مطالعہ کا موقع ملا اور وہ مسلمان ہو گئے، ان میں سے بعض نے جیلخانہ ہی میں ایک مسجد بھی بنالی۔

بلالی مسلمان سماجی خدمت میں پیش پیش رہتے ہیں اور ان برائیوں سے اپنے کو آلودہ نہیں کرتے جن میں عام امریکن ملوث ہوتے ہیں۔

امریکہ میں مسلمان عورتیں جمعہ کی نماز باجماعت ادا کرتی ہیں مگر مرد اپنی ملازمت اور کاروباری مشغولیتوں کی وجہ سے جمعہ کی نماز کے لیے مسجدوں میں نہیں جاسکتے ہیں چنانچہ وہ اتوار کو اجتماعی طور پر ظہر کی نماز ادا کرتے ہیں لیکن خطبہ صرف جمعہ ہی کو ہوتا ہے۔

امریکہ میں مسلمان عورتوں کیلئے شادی کا مسئلہ خاصا مشکل ہوتا ہے، ہندوستانی اور پاکستانی مسلمان مرد اپنے ملکوں ہی میں شادی کرکے بیویاں لیجانا پسند کرتے ہیں اسی لیے امریکن مسلمان عورتیں شوہر کی تلاش میں کسی عرب ملک مثلاً لبنان، شام یا پھر عیسائی کی طرف رجوع ہوتی ہیں، نو مسلم امریکنوں میں مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔

امریکہ میں مسلمان اقلیت میں ہیں امریکی حکومت یہودیوں کیطرح مسلمانوں کو بھی ایک اقلیت تسلیم کرتی ہے۔

(ش۔ اد)

اخبارِ علمیہ

اس عجائب زار دنیا میں روز آنہ ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں جو قدرت کی صناعی اور کرشمہ سازی کا مظہر ہوتے ہیں، ان بے شمار واقعات کو ضبط تحریر میں لانے کا منصوبہ ۱۹۵۵ء میں انگلینڈ کی گینس بروینگ کمپنی کے سربراہ سر ہیو بیور نے بنایا، انھوں نے محیر العقول واقعات اور ان کو صحت و تحقیق کے معیار پر پرکھنے کے لیے ایک دفتر قائم کیا اور جب ۱۹۵۵ء میں ان کا مجموعہ گنیس بک آف ورلڈ ریکارڈس کے نام سے شایع کیا تو یہ اتنا مقبول ہوا کہ اس کا شمار کثیر الاشاعت کتابوں کی فہرست میں آگیا، اسوقت سے یہ مجموعہ ہر سال پابندی سے شایع ہوتا ہے، اب تک اس میں ایک لاکھ چالیس ہزار واقعات درج ہو چکے ہیں اور ۳۱ زبانوں میں ۶۰ ملین کی تعداد میں اس کے نسخے فروخت ہو چکے ہیں، یہ تعداد خود ایک حیرت انگیز ریکارڈ ہے، اتنی زیادہ تعداد میں صرف بائبل کے نسخے ہی شایع ہوئے ہیں۔ اس سال اس کا پینتیسواں (۳۵) ایڈیشن شایع ہوا ہے جس میں ۱۵ ہزار نئے معلومات ہیں، مثلاً جدید ترین معلومات کے مطابق دنیا کی سب سے طویل قامت عورت بورینو کی ہے جو ۲ میٹر ۳۳ سنٹی میٹر لمبی ہے اور ابھی اس کی نمو جاری ہے، انگلینڈ کے ولسٹائر شائر میں دنیا کا سب سے زیادہ وزنی پھول ہے جو ۵۳ کیلوگرام کا ہے، بعض باتیں تو قطعی ناقابل یقین معلوم ہوتی ہیں، مثلاً دنیا کا سب سے طویل اسنومین

الاسکا میں ہے اور یہ ۲۰ میٹر اونچا ہے، یا ایک شخص ۳ سنتروں کو مسلسل ۶ گھنٹے ۲۴ منٹ تک اچھالتا رہا اور اس پورے وقت میں کوئی سنگترہ ہاتھ سے نہیں گرا۔

موجودہ تحقیق وطرز تاریخ نگاری سے ہر وقت خدشہ لگا رہتا ہے کہ مسخ تاریخ کا کوئی نیا نمونہ سامنے نہ آجائے، ابھی بمبئی سے حیدرآباد مرحوم کی تہذیبی واقتصادی تاریخ پر ایک کتاب شایع ہوئی ہے، شیلا راج کی اس کتاب کا نام "سوشیو اکونومک اینڈ کلچرل ہسٹری آف حیدرآباد ۱۹۱۱-۱۸۶۹" ہے، خوشی کی بات ہے کہ انھوں نے مورخانہ دیانت داری سے کام لیا، سر سالار جنگ کے حزم و تدبر کا ذکر کیا، انہیں مرد عصر کہا، محبوب دکن میر محبوب علی خاں نظام حیدرآباد کی مذہبی رواداری، مساوات پسندی، روشن خیالی اور جذبۂ خدمت کا خاص طور سے ذکر کیا، اگرچہ ریاست میں کئی مذاہب اور کئی زبانیں رائج تھیں اور مسلمان صرف دس فیصدی تھے، اس کے باوجود فرقہ وارانہ اتحاد کا خوشگوار ترین دور تھا، رعایا کو جابرانہ محاصل سے نجات حاصل تھی اور پوری ریاست نہایت خوشحال تھی، ۱۸۹۶ء کے قحط اور ۱۹۰۸ء کے سیلاب بلاخیز میں میر محبوب علی خاں نظام دکن نے جس جانفشانی اور محنت سے عوام کو راحت پہونچائی، اس کا خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی قیمت دو سو روپیے ہے اور اسے پاپولر پرکاشن بمبئی نے شایع کیا ہے۔

قارئین معارف کو علم ہوگا کہ ۱۹۸۸ء کا ادب کا نوبل انعام، مصر کے ادیب نجیب محفوظ کو ملا ہے مصر نے عباس محمود عقاد، احمد امین اور طٰہٰ حسین جیسے عالمی شہرت کے ادیب پیدا کیے، مگر نوبل انعام کے مستحق نجیب محفوظ قرار پائے، اس انتخاب پر اگرچہ مختلف حلقوں میں بہت چہ میگوئیاں ہوئیں مگر کویت کے موقر ماہنامہ "العربی" کے

بقول عرب اور اسلام نے جس تہذیب و ثقافت کی بنیاد رکھی اور جس ادبی ورثہ و سرمایہ کی وہ نگہداشت کرتے رہے، یہ انعام بہرحال اس کا اعتراف ہے" اس سے پہلے مراکش کے ایک افسانہ نگار طاہر بن جلون کو فرانس کا مقتدر انعام گانکر ایوارڈ مل چکا ہے، ایک ادیبہ سیدہ فیروز بھی فرانس کا ایک ادبی طلائی تمغہ حاصل کرچکی ہیں، عربی زبان و ادب کی یورپ میں یہ قدر شناسی گو تاخیر سے ہوئی لیکن یہ قابل ستایش ہے۔

گذشتہ معارف میں یہ خبر دی گئی تھی کہ جامع ازہر میں علوم اسلامی کا ایک شعبہ انگریزی میں بھی قائم کیا گیا ہے خوشی کی بات ہے کہ جامع ازہر کے موجودہ سربراہ شیخ جاد الحق علی جاد الحق، جامع کے شایان شان کئی علمی منصوبوں کو عملی جامہ دے رہے ہیں، حال ہی میں اسلامی معاشیات و معاملات اور شریعت اسلامی کے شعبوں میں ۳ مہینے کے ایک تربیتی دورہ کا آغاز کیا گیا جس میں ۱۳۱ اسلامی ممالک کے ۱۰۰ سے زیادہ اسکالر شریک ہوئے ہیں، مصر کے منتخب اساتذہ اور معاشیات کے ماہرین کی ایک جماعت اس میں تعاون دے رہی ہے، اس کے علاوہ مستشرقین کی دسیسہ کاریوں سے آگاہ رہنے اور غلط فہمیوں کے سدباب کے لیے ایک عالمی مرکز بھی قائم کیا جارہا ہے، یہ مرکز علوم اسلامی کے قدیم مراجع و مصادر کو خرابی و بربادی اور تحریف و تنقیص سے محفوظ رکھنے کی بھی سعی کرے گا، خدا کا شکر ہے کہ دار المصنفین کی آواز جامع ازہر کے ایوانوں میں بھی گونج گئی۔

ایشیا و افریقہ کے علاوہ یورپ میں خادمان اسلام سرگرم عمل ہیں، کیمبرج کی اسلامی اکاڈمی نے موتمر عالم اسلام کے تعاون سے ایک ورکشاپ کا اہتمام کیا ہے، جس میں پانچ سے سولہ برس تک کے طالب علموں کے لیے سماجی مطالعہ اور نیچرل سائنس میں

اسلامی نصاب کی تیاری کا انتظام کیا گیا ہے، ورکشاپ میں امریکہ، نائیجریا، ہالینڈ، برطانیہ اور سعودی عرب کے تقریباً ۲۲ نمایندوں نے حصہ لیا، رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل عبداللہ عمر نصیف خاص طور سے اس میں شریک ہوئے،

اسی اکاڈمی نے سائنس کی تعلیم اور مذہب کے موضوع پر آٹھ خطبات کا اہتمام کیا جس میں اسلامی اور مسیحی نقطہ ہائے نظر کی نمایندگی کی گئی۔

آکسفورڈ کے مرکز مطالعات اسلامی نے اپنی کارگذاری کا ایک سال اور پورا کرلیا، یہ مرکز ۱۹۸۵ء میں قائم کیا گیا تھا، اس عرصہ میں خطبات پیش کیے گئے، دوسرے ممالک کی اسلامی یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں سے ربط ہوا، آکسفورڈ نے اسلامی مطالعات کے لیے ایک مجلہ شایع کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ یورپ کی یونیورسٹیوں میں اسلام کے مطالعہ کے نام پر جو غلط فہمیاں دانستہ یا نادانستہ عام تھیں، ان کے ازالہ کی بڑی صورت پیدا ہو گئی۔

عربی فارسی اور اردو زبانوں کی خطاطی، اپنی خوبصورتی، نزاکت اور مہارت فن کی وجہ سے مشرقی فنون لطیفہ میں ممتاز مقام رکھتی ہے، ابھی دہلی میں جاپان کے پروفیسر یوکوناگارا نے جاپانی خوشنویسی کا ایک نمونہ پیش کیا تو یہ محسوس ہوا کہ نقطے، حروف اور سطریں ایک ماہر موسیقار کے سرود پر رقصاں ہیں، چین کی طرح جاپان میں خوشنویسی اور شاعری کو یکساں مقام حاصل ہے، جاپانی خطاطی میں ایک خاص نزاکت و نفاست ہے، یہ خط سدھام کے نام سے معروف ہے، اصلاً یہ ہندوستانی رسم الخط ہے، ایک روایت کے مطابق گوتم بدھ نے اپنے شاگردوں کو یہ خط سکھایا تھا، جاپان میں یہ پرستش کی حد تک مقبول ہوا، بھکشوؤں نے اپنی عقیدت و لیاقت سے اسے حیات نو بخشی، اس خط کا پہلا حرف احد و اعلیٰ کا مصداق ہے اور تمام حروف صحیح اور حروف علت بلکہ انسان کی زبان سے ادا ہونے والی ہر آواز میں یہ حرف کارفرما ہے۔ (ع ص)

ادبیات

حمد

از جناب فضا ابن فیضی ۔ مئو

یہ شاخ بھی تیری، برگ و ثمر بھی تیرے ہیں
یہ زندگی کے گھنیرے شجر بھی تیرے ہیں

مجھے ترازوئے انجم میں تولنے والے
شفق بھی تیری ہے، شام و سحر بھی تیرے ہیں

جزیرہ کیا، سمندر کہاں کا، ساحل کیا
تمام سلسلۂ بحر و بر بھی تیرے ہیں

ہو خوف کیوں مجھے دریا میں ڈوب جانے کا
یہ کشتیاں بھی ہیں تیری، بھنور بھی تیرے ہیں

ترا کرشمہ، وجود و عدم کا یہ نیرنگ
کہ بستیاں بھی ہیں تیری، کھنڈر بھی تیرے ہیں

یہ کائنات کی گردش، یہ آب و گل کا نظام
یہ چاک بھی ہیں تیرے، کوزہ گر بھی تیرے ہیں

تمام منظر و آئینہ، تیری ذات کا عکس
نظر بھی تیری ہے، صاحب نظر بھی تیرے ہیں

چلوں، کہیں سے، ترا ہی سفر قدم بہ قدم
کہ منزلیں بھی تیری، رہگذر بھی تیرے ہیں

عصا و چشمۂ حیوان و قم باذن اللہ
ملائکہ بھی، مسیح و خضر بھی تیرے ہیں

حرا بھی تیرا، حرا کا رواق بھی تیرا
مرے حرم کے یہ محراب و در بھی تیرے ہیں

جو بے نیاز ہے سجدوں سے، وہ جبیں بھی تیری
جو آستاں پہ جھکے ہیں، وہ سر بھی تیرے ہیں

ترے جمال سے روشن، افق افق میرا
یہ سب کواکب و شمس و قمر بھی تیرے ہیں

ترے قلم کی تراوش، تمام حرف مرے
یہ پارہائے نبات و شکر بھی تیرے ہیں

ورق ورق، یہ لپکتے چراغ بھی تیرے
یہ لفظ لفظ، دمکتے گہر بھی تیرے ہیں

باب التقریظ والانتقاد

السیرۃ النبویۃ (مولفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

(۲)

۵۔ اسباب و نتائج پر بحث اور حکمت و مصلحت کی وضاحت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج اور اسرا کا واقعہ بڑا اہتمم بالشان ہے مگر اس کو علم کلام کا ایک اہم اور نازک مسئلہ بنا لیا گیا جس کے پیچ و خم میں مفسرین اور سیرت نگار بھی الجھ کر رہ گئے اور انھوں نے گو ان پر بڑی طویل اور دقیق بحثیں کیں مگر ان کی نظر سے وہ حقائق و دقائق مستور رہے جو اس واقعہ کا اصل اور بنیادی مقصد تھا، سیرت کی بعض کتابوں میں بلاضرورت اس مسئلہ پر نہایت دور دراز کار اور بے سود بحثیں کی گئی ہیں جن سے عام قارئین کو نہ ہدایت و رہنمائی ملتی ہے اور نہ وہ کسی خاص نتیجہ تک پہنچتے ہیں۔

دراصل معراج اور اسرا کا واقعہ ایک ربانی انعام اور الٰہی عطیہ ہے، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توراۃ میں دیے گئے دو اندہ گانہ احکام و ہدایات کی تجدید اور ازسر نو توثیق ہے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آیندہ زندگی کا لائحۂ عمل بھی ہے جس سے آپؐ کو بڑی تقویت اور خاص ہدایت و رہنمائی ملی۔

معراج کے اسباب و انعامات اور اسرا کے اسرار و حکم کے متعلق مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے استاذ محترم علامہ سید سلیمان ندویؒ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بے مثال اور لاجواب ہے تاہم معراج مصطفےٰ کے درس و سبق اور اسکے بعض اسباب و انعامات فاضل مصنف کی زبان سے بھی سننے کے لائق ہیں ملاحظہ ہوں:-

"یہ اللہ کی جانب سے آپؐ کی ضیافت و تکریم اور تسکین خاطر کا سامان تھی اس طائف کے زخموں کو مندمل کرنا اور وہاں آپؐ کے ساتھ ہونے والی زیادتی و ناقدری اور ذلت و توہین آمیز سلوک کی تلافی تھی، ... یہ محض ایک انفرادی

و جزئی واقعہ نہیں ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ فرمایا اور آپؐ کے سامنے آسمان و زمین کی بادشاہی بے حجاب ہوئی بلکہ آپؐ کا یہ غیبی سفر گوناگوں گہرے اور دقیق معانی پر مشتمل اور بڑے دوررس اور حکیمانہ اشارات و لطائف کا حامل ہے، سورۂ اسرا اور سورۂ نجم میں جو اسی بارۂ خاص میں نازل ہوئی ہیں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ آپؐ قبلتین (مسجد حرام و مسجد اقصیٰ) کے نبی اور مشرق و مغرب کے امام ہیں، اپنے سے پیشتر کے تمام انبیاءؑ کے وارث اور جانشین اور اپنے بعد آنے والی قوموں اور نسلوں کے مقتدا ہیں، آپ کی ذات و شخصیت اور سفر معراج میں مکہ بیت المقدس سے اور مسجد حرام مسجد اقصیٰ سے ہم آغوش ہوگئی، آپؐ کے پیچھے انبیاءؑ نے نماز پڑھی، یہ دراصل آپؐ کے پیغام و دعوت کی عمومیت و ہمہ گیری، آپؐ کی امامت و قیادت کی ابدیت و خلود اور آپؐ کی تعلیم و ہدایت کے ہر دور، ہر قوم اور ہر ملک کے لیے یکساں مفید اور مناسب ہونے کا اعلان عام ہے، ... اس میں اس امت کے مقام و مرتبہ کا ذکر بھی ہے جس میں آپؐ کی بعثت ہوئی اور جو آپ پر ایمان لائی اور آپؐ کے پیغام و دعوت کی حامل ہوئی کہ وہ نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیغام کو ساری دنیا کی قوموں تک پہنچا کر اپنا فرض اور ذمہ داری ادا کرے گی" (السیرۃ النبویہ ص ۱۴۸ و ۱۴۹)

مصنف نے مدینہ کے لوگوں کے اسلام قبول کرنے پر آمادگی کے چند وجوہ و اسباب یہ بتائے ہیں۔

"یثرب کے انصار ... قبائل اوس و خزرج اور قریش و اہل مکہ میں چند باتیں

مابہ الامتیاز تھیں۔

۱۔ قریش کے برخلاف اوس وخزرج کے قبائل نرم مزاج اور نرم دل تھے، ان میں تشدد، تکبر اور انکار حق نہ تھا، ان اوصاف کا تعلق ان نسلی ونسبی خصوصیات سے تھا جن کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت اشارہ فرمایا تھا جب یمن کا ایک وفد آپ کی خدمت میں آیا تھا کہ "تمہارے پاس اہل یمن آئے ہیں، یہ بڑے نرم دل اور گداز قلب والے ہیں" مدینہ کے ان قبائل کا یمن ہی سے اصل تعلق تھا، زمانہ قدیم میں ان کے آباء واجداد وہاں سے منتقل ہو کر مدینہ آگئے تھے سورۂ حشر میں اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح فرمائی ہے۔

۲۔ انصار خانہ جنگی اور باہمی لڑائی سے بالکل عاجز ہو چکے تھے، حال ہی میں وہ بعاث کی جنگ کا مزہ چکھ چکے تھے اس لیے ان کو اتحاد سے رغبت اور جنگ سے نفرت ہو گئی تھی، ان کے اس قول سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی قوم کو چھوڑ کر آئے ہیں، کسی قوم کے اندر ایسی عداوت ونفرت اور ایسا شر وفساد نہ ہوگا جیسا ان کے درمیان ہے ممکن ہے آپ کی بدولت اللہ انہیں یکجا کر دے، اگر اللہ انہیں متحد کر دے گا تو آپ سے زیادہ باعزت کوئی شخص نہ ہوگا، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ یہ جنگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید ونصرت کی تقدیم وتمہید تھی۔

۳۔ نبوت اور انبیاءؑ سے قریش اور دوسرے عربوں کا تعلق طویل عرصہ سے ختم ہو گیا تھا اس کی وجہ سے وہ نبوت اور نبی کے مفہوم سے بھی ناواقف تھے، وہ امی اور ان پڑھ تھے، انہیں بت پرستی میں بڑا غلو تھا، انبیاءؑ سے نسبت رکھنے والی اور آسمانی کتابوں کی حامل قوموں سے بہت دور تھے قرآن میں اسی حقیقت کی طرف

ان لفظوں میں اشارہ کیا گیا ہے:۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ (یٰسین: ۶)

تاکہ تم ایک ایسی قوم کو خبردار کرو جن کے آباء کو خبردار نہیں کیا گیا تھا سو وہ غافل ہیں۔

مگر اوس وخزرج یہود کو نبوت اور انبیاءؑ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے سنتے اور توراۃ کا مفہوم بیان کرتے ہوئے اور اس کی تلاوت کرتے ہوئے دیکھتے تھے بلکہ خود یہود ان کو اس نبیؐ کے بارے میں بتاتے تھے اور کہتے تھے کہ آخری زمانہ میں ایک نبیؐ آئے گا جس کے ساتھ مل کر ہم تم کو عاد ارم کی طرح قتل کریں گے، اس کی وجہ سے اوس وخزرج اور مدینہ کے مشرک عرب باشندے اہل مکہ اور ان کے پڑوسی عربوں کی طرح دینی حقائق اور رموز الٰہی سے ناواقف نہ تھے بلکہ یہود کے ذریعہ ان باتوں سے مانوس اور آشنا ہو چکے تھے چنانچہ جب ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم ہوا اور وہ حج کے زمانہ میں مکہ آئے اور آپؐ نے انہیں اسلام کی دعوت دی تو ان کی آنکھوں سے پردہ اٹھ گیا اور ایسا محسوس ہوا کہ گویا وہ آپؐ کی دعوت کے منتظر اور اسے قبول کرنے کے لیے تیار بیٹھے تھے" (السیرۃ النبویہ ص ۱۵۲ تا ۱۵۶)

۶۔ اثرات ونتائج پر بحث | اہم غزوات خیبر اور تبوک وغیرہ کے اثرات ونتائج پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے لیکن طوالت کی وجہ سے ہم انہیں قلم انداز کرتے ہیں، البتہ فتح مکہ کے اثرات ونتائج کے متعلق فاضل مصنف عام الوفود ۹ھ کے زیر عنوان رقمطراز ہیں:۔

"یہ وفود کی آمد کا سال تھا کیونکہ عربوں کو اسلام کے بارے میں قریش کے رویہ کا انتظار تھا اس لیے کہ یہی لوگوں کے رہنما اور پیشوا اور بیت اللہ کے متولی تھے،

جب وہ سرنگوں ہوگئے، مکہ فتح ہوگیا اور قبیلہ ثقیف بھی حلقہ بگوش اسلام ہوگیا تو سب نے محسوس کرلیا کہ اب اسلام کی طاقت کو روکا نہیں جاسکتا، چنانچہ ہر چہار جانب سے وفود آنے لگے اور لوگ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہونے لگے، ان سب باتوں کا اثر قدرۃً عربوں کے دل پر پڑا اور اسلام میں داخلہ اور رسول اللہؐ سے مدینہ آکر ملاقات کرنے کا راستہ کھل گیا، ہدایت ربانی کے جویا خود مرکزِ اسلام میں اس کثرت سے آنے لگے جیسے موتی کی لڑی ٹوٹ گئی ہو اور اس کے سارے دانے اسلام کی آغوش میں گر گئے ہوں۔

یہ وفود نئی روح، ایمانی حرارت اور دعوت اسلامی کے جوش و جذبہ سے سرشار ہوکر اپنے مرکزوں اور علاقوں میں واپس جاتے اور ان کو شرک و بت پرستی اور اس کے آثار و نشانات اور جاہلیت کے طور طریقوں سے شدید نفرت ہوتی" (ایضاً ص ۳۰۷)

۷۔ علمی و تحقیقی بحثیں | مصنف نے یہ کتاب صرف دعوتی اور تبلیغی مقصد ہی سے نہیں لکھی ہے بلکہ اس کو عصری اسلوب اور علمی و تحقیقی معیار کے مطابق بنانے کی بھی پوری سعی اور کوشش کی ہے، مثالوں سے اس کا اندازہ ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر روم ہرقل کے نام جو خط روانہ کیا تھا اس میں ایک لفظ "اریسیین" کا آیا ہے، عام طور سے اس کے جو معنی بیان کیے گئے ہیں مولانا کو اس پر اطمینان نہیں ہے، اس کی تفصیل اور مولانا کی تحقیق ملاحظہ ہو۔

"یہ لفظ صرف ہرقل کے خط میں مذکور ہے، دوسرے خطوط میں اس کا کوئی ذکر نہیں، اس کے مفہوم کی تعیین میں علمائے لغت اور محدثین کا اختلاف ہے، مشہور قول یہ ہے کہ یہ اریسی کی جمع ہے جو خدمت گار، غلام اور کاشتکار کے معنی میں آتا ہے، ابن منظور

نے لسان العرب میں امام لغت ثعلب کے حوالہ سے یہی معنی لکھے ہیں مگر مشہور لغوی ابو عبیدہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میرے نزدیک اریس کو سردار اور بڑے کے معنی میں لینا زیادہ بہتر ہے لیکن اگر اس سے کاشتکار مراد ہے تو شہنشاہ ایران کسریٰ پرویز اس کا زیادہ مستحق تھا کہ اس کے خط میں اس کا ذکر ہوتا، اس لیے کہ کاشتکاروں کا طبقہ روم کی بازنطینی سلطنت کے مقابلہ میں ایران کی ساسانی سلطنت میں زیادہ تھا اور ایران کی آمدنی اور پیداوار کا اصل دار و مدار زراعت ہی پر تھا، لغت کے مشہور عالم ازہری کے حوالہ سے ابن منظور نے نقل کیا ہے کہ اہل سواد کسریٰ کے دین پر تھے جو زراعت پیشہ تھے اور اہل روم صنعت و حرفت والے تھے اور ساز و سامان تیار کرتے تھے اسی لیے وہ مجوس کو اریسیین کہتے تھے جس کے معنی کاشتکار کے ہیں اور عرب ایرانیوں کو فلاحین (کاشتکار) کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اس لیے ہمارے نزدیک مرجح قول یہ ہے کہ اریسیین سے مراد اریوس مصری کے پیرو ہیں جو ایک مسیحی فرقہ کا بانی تھا، اس نے مسیحی عقائد اور دینی اصلاح کی تاریخ میں بڑا حصہ لیا تھا" (ایضاً ص ۳۰۴ و ۳۰۵)

آگے اس کے توحیدی نظریہ اور اس کی سرگذشت وغیرہ بیان کرنے کے بعد لکھا ہے،

"اس لیے مرجح اور قرین عقل یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ آپؐ کے ارشاد گرامی فان تولیت فان علیک اثم الاریسیین میں اریسیین سے مراد یہی فرقہ ہے"
(السیرۃ النبویہ ص ۳۰۷)

مولانا نے اپنے بیان کردہ معنی کی تائید میں امام ابو جعفر طحاوی اور امام نووی شارح مسلم کے اقوال بھی پیش کیے ہیں جن میں اس لفظ کے قریب قریب یہی معنی بتائے گئے ہیں۔

عام لوگ مکہ کو شہر کے بجائے ایک گاؤں سمجھتے ہیں، مولانا نے اس کی تردید میں جو کچھ لکھا ہے وہ علمی و تحقیقی حیثیت سے قابل مطالعہ ہے، ملاحظہ ہو۔

"رسول اللہ صلعم کی بعثت کے زمانہ کے حالات سے ناواقفین اور عربوں کی تاریخ، روایات، شاعری اور عادات و احوال پر وسیع نظر نہ رکھنے والے لوگ خیال کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں مکہ ایک معمولی سا گاؤں تھا، جہاں زندگی عقلی، اجتماعی اور تمدنی لحاظ سے دور طفولیت اور ابتدائی مرحلہ میں تھی، اس میں چند قبائل آباد تھے، جو خیموں میں رہتے تھے، ان کے خیموں کے ارد گرد اونٹوں، بھیڑ، بکریوں اور گھوڑوں کے رہنے کی جگہیں تھیں، مکہ کے باشندے وادیوں کے کنارے اور پہاڑوں کی گھاٹیوں میں پھیلے ہوئے تھے، ان کی غذا خشک روٹی یا اونٹ کا گوشت تھا جس کو وہ اچھی طرح پکانا بھی نہیں جانتے تھے، موٹے اور سخت کپڑے پہنتے جو اونٹوں کے بالوں سے بنے ہوتے تھے، نہ کھانے پینے میں توسع و تنوع تھا، نہ لباس میں حسن و دلکشی تھی، زندگی تکلف سے بری، خیالات وسعت و بلند پروازی سے عاری اور احساسات نزاکت و لطافت سے خالی تھے،

مگر مکہ کی یہ تصویر تاریخی حقائق کے خلاف ہے، تاریخ کی کتابوں، عربی ادب اور جاہلی شاعری میں چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں مکہ کی تصویر اس کے برعکس یہ ملتی ہے کہ اہل مکہ کے عادات، روایات اور مظاہر زندگی ابتدائی بدویانہ زندگی سے نکل کر ابتدائی شہری و تمدنی زندگی میں داخل ہو چکے تھے، مکہ کی یہ تصویر قرآن مجید کی صراحت کے بھی خلاف ہے، اس میں اس کے جو اسماء و اوصاف بیان کیے گئے ہیں وہ معمولی اور چھوٹے گاؤں یا بدوی زندگی پر منطبق نہیں ہوتے،

اس نے مکہ کو ام القریٰ کہا ہے اور البلد اور البلد الامین بھی کہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مکہ پانچویں صدی عیسوی کے وسط ہی میں بدویت سے حضارت کے دور میں پہنچ گیا تھا اگرچہ یہ تہذیب محدود دائرے میں تھی اور مکہ ایک ایسے نظام کے ماتحت تھا جس کی بنیاد باہمی اتفاق و تعاون، اجتماعی مفاہمت اور تقسیم کار پر تھی، اس نظام کی بنیاد قصی بن کلاب نے رکھی تھی جن کی پانچویں پشت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، (السیرۃ النبویہ ص ۸۳ و ۸۴)

مصنف نے کہیں کہیں مختصر مگر محققانہ حواشی لکھے ہیں، طوالت کے خوف سے صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے، سلاطین کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطوط لکھے تھے وہ کب بھیجے گئے مولانا فرماتے ہیں۔

"قابل ترجیح قول یہ ہے کہ نامہ ہائے مبارک ماہ ذی الحجہ ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد روانہ کیے گئے، واقدی کی یہی رائے ہے ۶ھ کے مطابق عیسوی سنہ ۶۲۷ء ہے اس لیے کہ سلاطین میں سرفہرست ایرانی شہنشاہ کسریٰ پرویز کا نام آتا ہے جو مارچ ۶۲۸ء میں قتل کر دیا گیا تھا، اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ صلح حدیبیہ کا واقعہ ۶۲۷ء کے شروع میں پیش آیا تھا، ایسے ہی ہرقل کو بھیجے جانے والے خط کا ۶۲۸ء میں پہنچنا مستبعد ہے کیونکہ وہ اسی سال آرمینیا کے لیے روانہ ہوا تھا،

(السیرۃ النبویہ ص ۳۵۵ بحوالہ الفرڈ بٹلر کی کتاب عربوں کی فتح مصر)

شکوک و اعتراضات کا ازالہ

مصنف نے شکوک و اعتراضات کو رفع کر کے سیرت نبوی کو ہر داغ دھبے سے پاک و صاف بتایا ہے، معترضین نے آپ کے غزوات کو خاص طور پر ہدف طعن و تشنیع بنایا ہے، مولانا نے آپ کے آخری غزوہ تبوک کے ذکر کے

بعد "نظرۃ علی الغزوات" (غزوات پر ایک نظر) کے زیر عنوان جو کچھ لکھا ہے اس سے نہ صرف اس اعتراض کی تردید ہوتی ہے بلکہ خود معترضین کا دامن داغدار معلوم ہونے لگتا ہے ع

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

"غزوۂ تبوک رجب ۹ھ میں ہوا، اسی پر آپؐ کے غزوات کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے جن کی تعداد ۲۷ ہے سرایا کی تعداد ۶۰ کے قریب ہے لیکن بعض سرایا میں جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات وسرایا میں خوں ریزی ضرور ہوئی مگر جنگوں کی تاریخ میں اس سے کم خوں ریزی کی مثال نہیں ملتی، ان تمام غزوات میں دونوں فریقوں کے مقتولین کی مجموعی تعداد ۱۰۱۸ سے زیادہ نہیں ہے لیکن اس قلیل تعداد کی وجہ سے جن لوگوں کی جان وعصمت محفوظ رہی ان کی تعداد کو کون شمار کرسکتا ہے، اس خوں ریزی کے نتیجہ میں پورے جزیرۃ العرب اور اس کے اطراف میں ایسا امن وامان قائم ہوا کہ ایک عورت بھی بے خوف وخطر حیرہ اور قادسیہ سے خانۂ کعبہ کا طواف کرنے کے لیے مکہ چلی آتی ہے جبکہ اس سے پہلے پورے عرب میں قتل وغارتگری کا بازار گرم اور جنگوں اور معرکہ آرائیوں کا لامتناہی سلسلہ قائم تھا، بڑی بڑی حکومتوں کے قافلوں کو بھی مکمل حفاظتی تدابیر اور ماہر رہبروں کے بغیر سفر کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

ان تمام غزوات کی بنیاد قرآن حکیم کے یہ دو حکیمانہ اصول تھے الفتنۃ اشد من القتل اور ولکم فی القصاص حیوۃ یا اولی الالباب،

ان اصولوں نے نوع انسانی کا بڑا وقت بچایا اور لوگوں کو اصلاح احوال اور خطرات کے سدباب کے لیے جہد ومشقت نہ اٹھانی پڑی، یہ لڑائیاں جن اخلاقی تعلیمات اور مشفقانہ وہمدردانہ ہدایات کے تحت لڑی گئیں ان کا نہ منتقمانہ کارروائی سے کوئی تعلق تھا اور نہ ان کی غرض لوگوں کو اذیت وعذاب میں ڈالنا تھا، انہیں صرف تادیبی کارروائی کہا جاسکتا ہے۔

یہ جنگیں صرف دس برس تک جاری رہیں اور [illegible] مربع میل کے اندر ہوئیں، دس برس کے بعد کروڑوں مربع میل کے لوگ اسلامی قانون کے سامنے سرنگوں ہوگئے،

آپؐ جب کسی لشکر کو روانہ فرماتے تو تاکید کرتے میں تمہیں اللہ سے ڈرنے اور اپنے ساتھی مسلمانوں سے حسن سلوک کی تلقین کرتا ہوں، اللہ کے نام سے اسی کی راہ میں ان لوگوں سے قتال کرنا جنھوں نے اللہ کے ساتھ کفر کیا ہے، دھوکہ نہ دینا، مال غنیمت میں خیانت نہ کرنا، کسی بچے، عورت، بوڑھے اور عبادت گاہ میں بیٹھے ہوئے گوشہ نشین کو قتل نہ کرنا، کسی کھجور کو ہاتھ نہ لگانا، کسی درخت کو نہ کاٹنا اور کسی عمارت کو نہ گرانا۔

غزوات نبویؐ کا مقابلہ گذشتہ دو عالمی جنگوں سے کیجئے جن میں سے پہلی (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) اور دوسری (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) میں ہوئیں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے فاضل مقالہ نگار نے تصریح کی ہے کہ پہلی عالمگیر جنگ میں ۶۴ لاکھ اور دوسری میں ساڑھے تین سے ۶ کروڑ آدمی مارے گئے سب کو معلوم ہے کہ نہ ان دونوں جنگوں نے کوئی انسانی خدمت انجام دی اور نہ عالم انسانی کو

ان سے تھوڑا یا بہت فائدہ ہی پہنچا، قرون وسطیٰ میں یورپ کی تحقیقاتی عدالتوں اور کلیسا کے ظلم و استبداد کے نتیجہ میں ایک کروڑ بیس لاکھ افراد لقمۂ اجل بنے"

(السیرۃ النبویہ ص ۳۷۳ و ۳۷۴)

۹۔ **بعض معنی خیز عنوانات** | فاضل مصنف کے بعض عنوانات بڑے معنی خیز اور لطیف ہیں، مثلاً ص ۱۶۶ پر [وللہ جنود السمٰوٰت والارض] کا عنوان ہے اس کے تحت لکھتے ہیں کہ

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ جب غار ثور میں داخل ہوئے تو اللہ نے مکڑی بھیجی اس نے غار اور اس کے منھ پر جو درخت تھا اس کے درمیان جال بن دیا اور دونوں حضرات کو چھپا دیا، اسی طرح اللہ نے دو جنگلی کبوتریں کو بھیجا جو منڈلاتے رہے اور پھر جال اور درخت کے درمیان بیٹھ گئے "وللہ جنود السمٰوٰت والارض سورۃ الفتح ۴" (السیرۃ النبویہ ص ۱۶۶)

یہی عنوان غزوۂ خندق کے ضمن میں بھی ملتا ہے، جب اسلام کو مٹانے کے لیے پورا عرب امنڈ پڑا تھا اور مدینہ کا محاصرہ ہر طرف سے کر لیا گیا تھا اس وقت خدا کی غیبی مدد تیز و تند آندھی کی صورت میں نمودار ہوئی اور دشمنوں کے خیمے زیر و زبر ہو گئے اور ان کے قدم اکھڑ گئے (ص ۲۵۴)

غزوۂ خیبر کا ذکر "جائزۃ من اللہ" کے ضمنی عنوان سے شروع ہوا ہے اس کے تحت جو مضمون بیان ہوا ہے اس پر غور کیجئے تو عنوان کی معنویت و لطافت کا اندازہ ہو، مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"حدیبیہ میں بیعت رضوان میں جو لوگ شریک تھے انھوں نے اللہ اور

اس کے رسول کی اطاعت کی تھی اور اللہ کے حکم کو اپنی مرضی و خواہش اور اپنی عقل و رائے پر مقدم رکھا تھا اللہ نے انہیں فتح قریب اور غنیمت کی بشارت دی تھی ان فتوحات و غنائم کا مقدمہ غزوۂ خیبر تھا"

۱۰۔ **نقشے** | کتاب میں مختلف جگہوں کے بہت اہتمام سے نقشے دیئے گئے ہیں تاکہ جو باتیں تحریر سے سمجھ میں نہیں آئیں وہ ان کی مدد سے آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجائیں، مولانا کا بیان ہے کہ یہ نقشے تاریخی معلومات اور اس عہد کی تاریخ کے مطالعہ کی روشنی میں تیار کیے گیے ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ وہ فنی و علمی حیثیت سے ہر طرح مکمل اور عہد جدید کے مطابق ہوں۔ خصوصیات اور ہیں مگر تلک عشرۃ کاملۃ

القانون فی الطب تالیف شیخ الرئیس ابو علی الحسین بن عبد اللہ ابن سینا
الکتاب الأول والکتاب الثانی تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات،
الکتاب الاول ۳۳۴ والکتاب الثانی ۴۱۶، انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری، میڈیسن اینڈ
میڈیکل ریسرچ، نئی دہلی۔

شیخ الرئیس ابو علی سینا (م ۴۲۸ھ / ۱۰۳۷ء) فلسفہ وطب کا امام اور ایک عبقری شخص تھا، اس نے سب سے پہلے طب کے اصول ومبادی کو منضبط ومدون کیا، اور متعدد تصنیفات یادگار چھوڑیں، جن میں سب سے زیادہ مشہور، اہم اور معرکہ آرا کتاب "القانون فی الطب" ہے، جو دراصل طب یونانی کی انسائیکلوپیڈیا اور اس کا مکمل دستور ہے، اس میں ہر قسم کے نظری وعملی طبی مسائل زیر بحث آئے ہیں، اور اس کتاب سے کوئی طبیب بے نیاز نہیں رہ سکتا، القانون کی اہمیت ہی کی وجہ سے مشرق ومغرب کی متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے کیے گئے، اور اس کی شرحیں اور خلاصے لکھے گئے، چند برس قبل شیخ کی ہزار سالہ برسی منائی گئی، اس کی مناسبت سے انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ نئی دہلی نے شیخ کی معرکۃ الآرا کتاب "القانون" کا ایک صحیح اور مکمل نسخہ شائع کرنے کا پروگرام بنایا، "القانون" اصلاً پانچ کتب پر مشتمل ہے، زیر نظر جلدیں الکتاب الاول اور الکتاب الثانی ہیں، اول میں فن طب کے کلی امور بیان کیے گئے ہیں، اور یہ چار فنون پر مشتمل ہے، ہر فن میں متعدد عنوانات وفصول ہیں، اور ان کے تحت طب کے بڑے اہم اور بنیادی مسائل تحریر کیے گئے ہیں، دوسری کتاب میں مفرد دواؤں کا ذکر ہے، یہ اصلاً دو مقالات پر مشتمل ہے، دوسرے مقالہ میں حروف تہجی کی ترتیب سے دواؤں کے نام اور ان کے خواص وغیرہ تحریر کیے گئے ہیں، دونوں جلدوں کے شروع میں معہد کے صدر جناب حکیم عبد الحمید صاحب کے قلم سے عربی میں اور آخر میں انگریزی میں مقدمہ ہے، اس میں تصنیف کی اہمیت اور مصنف کی عظمت بیان کر کے القانون کے ان مطبوعہ ومخطوطہ نسخوں کا ذکر کیا ہے، جن سے مقابلہ ومراجعت کے بعد یہ اڈیشن شائع کیا گیا ہے، حواشی میں نسخوں کے فرق واختلاف کو ظاہر کیا گیا ہے، اس معرکہ آرا کتاب کی اشاعت ایک مفید علمی وطبی خدمت ہے، حکیم عبد الحمید صاحب اس ناموافق دور میں طب یونانی کو فروغ دینے کی جو جد وجہد کر رہے ہیں، اس کتاب کی اشاعت اسی سلسلہ کی ایک مفید کڑی ہے۔

تذکرہ مصلح الامت حصہ دوم: مرتبہ مولانا محمد قمر الزماں صاحب،
تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۰۰، مجلد قیمت ۲۷ روپیے
پتہ: مکتبہ دار المعارف ۴۰۷، بخشی بازار، الہ آباد۔

اس تصنیف لطیف کے حصہ اول کا ان صفحات میں پہلے ذکر آچکا ہے، اس دوسرے حصہ میں صاحب سوانح کے متعلق ان کے اقران ومعاصرین اور بعض اکابر اور خاص مسترشدین کے مکاتیب وملفوظات اور نگارشات جمع کی گئی ہیں، جن سے ان حضرات سے مولانا وصی اللہ صاحب کے روابط وتعلقات کا حال معلوم ہوتا ہے، اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمام بزرگ ان کے علم وفضل، ورع وتقویٰ، ارشاد واصلاح اور سلوک وعرفان میں عظمت وکمال کے معترف تھے، اس ضمن میں تصوف وطریقت کے متعدد اہم نکات وحقائق بھی زیر تحریر آگئے ہیں جن کی تشریح وتوضیح لائق مرتب نے موثر انداز میں کی ہے، وہ خود اس راہ کے رہرو ہیں اور مولانا شاہ وصی اللہ صاحب سے ان کا گہرا اصلاحی وروحانی تعلق رہا ہے، اس لیے ان کی پیشکش سے یہ کتاب دو آتشہ ہوگئی ہے۔ "ض"

کتابیں ملیں

مضامین بحر العلوم مرتبہ جناب مفتی عبد المنان اعظمی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۲۰، قیمت ۲۰ روپیہ پتہ: مفتی پبلیکیشنز مبارکپور، اعظم گڈھ - یو-پی

الشاھد مرتبہ جناب مفتی عبد المنان اعظمی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۳۲۸، قیمت درج نہیں پتہ: حق اکیڈمی، مبارکپور، اعظم گڈھ، یو-پی

امتیاز حق مرتبہ جناب راجا غلام محمد صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۷۶، قیمت مجلد ۶ روپیے غیر مجلد ۵ روپیے، پتہ: المجمع الاسلامی مبارکپور، اعظم گڈھ - یو-پی

شراب ایک زہر قاتل مرتبہ جناب مفتی عبد القادر بستوی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۸۰، قیمت دس روپیے، پتہ رشید بکڈپو، گوریتی بازار کھیا سرائے جونپور - یوپی

حلیہ نبی اکرمؐ مرتبہ جناب عبد السلام مضطر منصوری، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۳۲ منظوم قیمت ۶ روپیے پتہ مکتبۃ الفیض مدرسہ کرامتیہ دار الفیض جلال پور فیض اباد، یو، پی

حکایات ہستی مجموعہ کلام جناب سید شاہ محمد حسن بسمل عظیم آبادی مرتبہ جناب سید شاہ مہدی حسن وسید شاہ ہادی حسن نسیم، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۸۴ قیمت ۲۰ روپیے پتہ: سید شاہ اختر حسن بسری باغ بیتہ

یاد وطن مرتبہ جناب عبد المجید شمس عظیم آبادی تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۱۲۶ مجلد مع گردپوش، قیمت دس روپیے پتہ: سائنٹفک پبلشرز مجید ویلا، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶

شہ رگ مرتبہ جناب نسیم طارق صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۱۱۲ مجلد مع گردپوش قیمت ۱۲ روپیے پتے: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۲۵، علی گڈھ، بمبئی ۳، مکتبہ عکا ابراہیم رحمت اللہ روڈ نمبر ۲ مینارہ مسجد بمبئی ۳

ابر تر مرتبہ جناب فرید پربتی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۴۸ مع خوبصورت ٹائٹل، قیمت ۵ روپیہ پتہ: مکتبہ علم وادب ریڈ کراس روڈ سری نگر، کشمیر

اپنی نمازیں درست کرلیں مرتبہ جناب عزیز احمد صدیقی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی صفحات ۴۸ پتہ: جامعۃ الحق کراچی ۳۱

خوشبو کا کرب مرتبہ جناب نکہت خاں صاحبہ، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۸۰ مجلد مع خوبصورت گردپوش قیمت ۵ روپیے پتہ: شالیمار پبلیکیشنز، نیا ملک پیٹ، حیدر آباد ۳۶